گجندر سنگھ
ایشیا پبلشرز
۵- بہار گوالین دھلی ۶

فخر کی بات

گجندر سنگھ

ترتیب

میں سکھ ہوں۔

آپ کوئی بھی ہوں۔ کسی مذہب، فرقے یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ کسی خطے، علاقے یا وطن کے باشندے ہوں لیکن آپ کا ایک نجی نام ہے۔ اپنے ایک سر ایک دھڑ دو باہوں ٹانگوں کو آپ مکمل زندگی مکمل سماج مکمل دنیا مانتے ہوں گے۔

چنانچہ میں ایک سکھ ہوں۔ میری پیٹ تک لمبی داڑھی ہے۔ میری یہ لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔ اور میں اپنی ذات کو اپنے خیالات کو اپنے کردار کو آپ سے الگ تھلگ سمجھتا ہوں۔ جب مجھے مخاطب کرتے ہیں تو فوراً میں چوکنا ہو جاتا ہوں اور مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں آتا۔ میں آپ کی آنکھوں، آپ کے نتھنوں، آپ کے ہونٹوں اور جبڑے کی ہر تھرکن ہر جنبش کو گھور کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہوں کیونکہ مجھے اپنی چالاکی اور ہوشیاری پر بھروسہ ہے اور جہاں میری باہوں کی لمبائی ختم ہوتی ہے، جہاں میری ٹانگوں کی وسعت ختم ہوتی ہے جہاں میری نگاہوں کا افق مقرر ہوتا ہے۔ جہاں میرے جذبوں کا ایک دائرہ بن جاتا ہے۔ اس کے بغیر یا تو کچھ نہیں ہے یا جو کچھ ہے میرے خلاف ہے۔

اس حد تک تو میرے اور آپ کے خیالات ملتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہمارے خیالات ملتے ہوں۔ اس کے بغیر لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ میرا سکھ ہونا یا آپ کا کسی مذہب یا فرقے یا گروہ سے تعلق رکھنا بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔

بین عیش و عشرت کی بات ہے۔

میں روزی کمانے کے لئے ملازمت کرتا ہوں، وہاں میرے نام کی اہمیت نہیں رہتی یا میرے مذہب یا اقتصادی، سیاسی، سماجی خیالات کی وقعت نہیں ہوتی۔ مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ میں اسی طرح سوچتا ہوں اسی طرح بولتا ہوں وہی کچھ کرتا ہوں جو ہر کوئی کرتا ہے۔ اور اگر مجھے ملازمت چھوڑنے کی ضد ہو تو میری جگہ کتنے لوگ میرے فرائض کو اسی خوش اسلوبی سے نبھا سکیں گے۔

ایک صابن کی ٹکیا، سبزی، دال اور آٹا اور کپڑا خریدتے وقت میرا وہی رویہ ہوتا ہے جو آپ سب کا ہوتا ہے۔ میری کھونٹی پر لٹکے کپڑے بالکل ویسے ہی ہیں جو آپ کی کھونٹی پر ہونے تو پہچان نہ ہو سکتی۔ میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ میری ٹانگوں میری باہوں میرے دھڑ کا کسی اقتصادی، سیاسی، سماجی فرقے یا گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں میرے نتھنے میرے کان، میری آواز میرا حلق میرا پیٹ کسی خطے علاقے یا وطن کے باشندے نہیں۔ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلا جاؤں تو میری آنتیں کام سے جواب نہ دیں گی۔ میرا دل لگاتار دھڑکتا رہے گا۔ دھونکنی کی طرح پھیپھڑے سانس کھینچتے اور چھوڑتے رہیں گے۔ میں پھر ملازمت کر لوں گا اور میرے نام کی دو کوڑی قیمت نہ پڑے گی۔ وہی ایک صابن کی ٹکیا، سبزی دال اور آٹا اور کپڑے جب میرے ہاتھوں کی گرفت میں نہ رہیں گے تو میرے نہ ہوں گے۔ جیسے میرے اپنے بازو، ٹانگیں، سر میرے ساتھ چپکا نہ ہوں تو میرے نہیں رہتے۔ نجانے میرے جسم کا کونسا حصہ ہے جو "میں" ہے۔ نجانے میں کہاں کا سکھ ہوں، آپ کہاں کے مذہب اور ملت والے ہیں۔

میں نے ایک ڈنڈے پر کئی جھنڈے چڑھتے اور اترتے دیکھے ہیں۔ ہر جھنڈے کے ساتھ توپ داغی گئی تھی۔ ہر جھنڈے کو آگ میں جھونکا گیا تھا۔ میں نے زمین کا ایک نقشہ آنکھوں پر بچھایا تھا میں نے اس بڑے نقشے کو اپنا ملک مانا۔ چرچاتی کی طرح لقمے نے

اور جوں جوں نقشے ٹوٹے، میں تنہائی میں باقی ماندہ بڑے ٹکڑے کا نقشہ بناتا رہا۔ اب میں پلکیں جوڑ کر نتھنے پھلا کر ہونٹ لٹکا کر حب الوطنی کے گیت فلک شگاف جھنکاڑ کے ساتھ تن کر گا سکتا ہوں۔ میں ایک چھیچھڑے کو اپنا وطن کہنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

مجھے اپنے نام سے محبت ہے۔ کسی دوسرے نام سے نہیں۔ مجھے اپنے گھر سے محبت ہے محلے بھر سے یا شہر سے یا ملک سے نہیں۔ یہی وجہ ہوگی کہ مجھے عموماً نام یاد نہیں رہتے۔ مجھے ناک کا تر چھا پن یا آنکھوں کا تیکھا پن یا ہونٹوں کی دھار یاد نہیں رہتی۔ جیسے اکثر نیم خوابی میں آدمی پہچانا جاتا ہے۔ اس کی گفتگو اس کی ہر حرکت شفاف ہوتی ہے لیکن اس کی شکل و صورت صاف نظر نہیں آتی، یونہی میں اپنے ہیرو سے ملتا ہوں۔ نجانے وہ کس مذہب کا متوالا ہے، نجانے وہ کس وطن کا رہنے والا ہے، کس علاقے پر جان دیتا ہے۔ نجانے وہ گورا ہے گندمی ہے مٹیالا ہے یا ایسا بھونڈا آدمی ہے جسے چلبہری نے سفید اور سرخ کر دیا ہے۔

عرصہ ہوا میرا ایک افسانہ ایک بڑے آدمی کے ہاتھوں لگا۔ بڑے آدمی نے لکھا۔

"میں نے تمہارا افسانہ پڑھا ہے۔ میں یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ تم افسانہ نگاری کے فن سے بخوبی واقف ہو۔ ...... افسانہ خوب شروع ہوا اور نہایت سنسنی خیز طریقہ سے مجھے (پڑھنے والے کو) آخر تک جکڑے رہا۔ محض خاتمے پر میں سوچ سکا کہ بحیثیت ایک نقاد اس سے پہلے کہ میں اپنا فیصلہ صادر کروں ......

میرے سوال کا جواب دو تاکہ میں ...... اپنی رائے دوں۔"

پانچ ہفتوں کے بعد بڑے آدمی نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔

"...... میں تمہارا افسانہ واپس بھیج رہا ہوں اس رائے کے ساتھ (تمہاری کہانی کا ہیرو جس کا نام (خیر، تم نے اس کا نام رکھا ہی نہیں) ......

مخلص ——— ر۔ س۔ ب

قدرتی طور پر میں محظوظ ہوا۔ افسانہ پڑھتے ہی پہلا خط لکھتے وقت اس خصوصیت کا احساس نہ ہوا ہوگا کہ ہیرو کا نام نہیں ہے بلکہ افسانے کے کسی کردار کا نام نہیں ہے۔ وہ افسانہ اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔

فنون لطیفہ کے اکثر شعبوں میں تخیل سے خوب کھیلتے ہیں۔ بھٹی میں کیچڑ میں انڈیلتے ہیں، موتیوں اور ہیروں میں ڈھکاتے ہیں۔ لیکن آخر کار تخیل، تاروں کی ٹمٹماتا، صاف شفاف چمک دمک کے ساتھ ویسا کا ویسا رہتا ہے۔ اس پر ملک، شہر، مذہب، سماج کی چھاپ کپڑے کے تھان پر لگی چھاپ کی طرح فایدہ اور غیر ضروری ہے۔ جو ایک بار دھوبی کی بھٹی میں جاتے ہی دھل جاتی ہے۔ ہماری موسیقی میں ترانہ، یا آرکسٹرا۔ مصوری، بت تراشی میں ABSTRACTISM اسی طوفانی ریلے کی اختراع ہیں جسے افسانے میں جگہ نہ ملی۔ شاید آپ مجھ سے متفق ہوں کہ افسانوں میں ہیرو کے نام کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کی نوکیلی ناک یا گورے چٹے ماتھے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے شہر یا محلے یا ملک کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن افسانے کی اصلاحات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ ایک نیا قدم ہے۔

گجندر سنگھ

نئی دلّی

آسمان کا تھوکا

رقم گننے کے بعد لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے نوٹ بک میں تحریر کر کے اندر جھانکا اور مطمئن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ واسکٹ کے اندر جیب میں اس نے ساری رقم، جو تھوڑی سی تھی، رکھ لی۔ رات ہو چکی تھی۔ تاہم اس نے لالٹین کی لو کو اور بھی کم کر کے دیئے چھوڑ دیا اور خود اندر آ گیا۔

وہ ٹھگنا آدمی ہمیشہ رقم کو اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ روپے کے معاملے میں وہ بجد غور و فکر سے کام لیتا تھا۔ روپیہ اسے بہت عزیز تھا۔ محض نجی ہی نہیں۔ اگر اس کی حفاظت میں کوئی بھی اپنی رقم دے جاتا تو وہ اسی خیال اور انہیں جذبات سے سنبھال کر رکھتا۔

اسی لئے آمدنی وہ اپنے پاس رکھتا تھا اور اس کا ساتھی اسی گندے اور بدبودار تنور پر روٹی پکا دیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھی سے بہتر کام کر سکتا تھا لیکن اکیلا سب کام وہ کیونکر سرانجام دے سکتا۔ اور پھر اس کے اپنے نجی پیسے نہیں تھے۔ اس کے

ساتھی باورچی کی رقم تھی جو تنور سے تھوڑی سی آمدنی پیدا کر دیتی تھی جسے وہ دونوں بانٹ لیتے تھے۔

اس نے کرسیاں اٹھا کر میزوں پر رکھ دیں ہمیشہ کی طرح آمدنی کم ہوتی تھی اور امید باقی رہ جاتی کہ کچھ اور اضافہ ہو سکتا۔ اس نے ٹھنڈا سانس لے کر بے حد بدوضع اس چھوٹے سے ہال کو دیکھا اور پیچھے، باورچی خانے میں اپنے ساتھی کے پاس آگیا۔

"سو؟" باورچی نے کہا۔ "سو؟ کام ختم۔"

اس نے واسکٹ کے اندر رقم کو ٹٹولا۔ "کچھ خاص نہیں ——— وہی۔ وہی ———" وہ بڑبڑایا۔ اور ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ باورچی نے پچھلے برتنوں کو چکنے میلے میز پر رکھ کر اسے بڑی سنجیدگی سے دیکھا ——— "ایک پلیٹ نہیں ہے۔"

وہ دونوں بڑے فکرمند، باورچی خانے سے باہر بھاگے۔ تاریک چھوٹے سے کمرے میں جسے وہ ہال کہتے تھے، انہوں نے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سب کرسیاں کھینچ دیں۔ پلیٹ ندارد تھی۔ باورچی نے حاکمانہ دریافت کیا۔

"کہاں رکھی تھی ———؟"

"کہاں ——— ؟" اس نے کہا۔ "یہ تم بتا دو، تو میں ابھی اٹھا کر دے نہ دوں ———؟" اسی لمحہ باورچی کے پاؤں سے پلیٹ ٹکرا کر لڑھکتی چلاتی چلی گئی ——— وہ دونوں سُن رہ گئے۔ لیکن پلیٹ ٹوٹی نہیں۔ ٹھگنے نے جو بوائے کا کام کرتا تھا، جھٹ اٹھا کر پلیٹ باورچی کو دیدی۔

دونوں یکدم کپکپائے اور باورچی نے تیزی سے پلیٹ کو میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ان دونوں کے چہروں پر نفرت اور چڑچڑاپن نمودار ہوا۔

باورچی نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ــــ "میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس شخص کو تم نے یہ پلیٹ دی تھی۔ ؟"

"کیسے ــ ؟" اس نے کہا۔ "یہ تم بتا دو تو میں ابھی اسے ٹھکانے لگا دوں۔"

اور دونوں نے مل کر پلیٹ کو بغور دیکھا۔ وہ گاہک جسے یہ پلیٹ پیش کی گئی تھی، اپنی بلغم اسی میں تھوک گیا تھا اور ایک گولی بنی وہ غلاظت چکنی پلیٹ پر جم گئی تھی۔

محض باہر ٹپری لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ برساتی سیاہ رات اور مینڈکوں، جھینگروں کا لگاتار شور ان کے ذہنوں کو خواہ مخواہ تشنج دینے کو کافی تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر تاریکی میں کھوئے اس کے چہرے پر محض چمکتی ہوئی دو آنکھوں کو گھورا۔

"کیا یہ میرا کام ہے۔"

"جھوٹے برتن تو میں مانجھ سکتا ہوں اور یہ ـــ ؟" اس نے پلیٹ کو اس کے آگے سرکا دیا۔ "یہ ــ" بوائے بڑبڑایا ــــ "یہ سراسر حماقت تھی اس شخص کی ایک بدتمیزی تھی۔"

"کون تھا وہ ــــ ؟" وہ اور آگے کھسک آیا۔

"یہ تم بتا دو۔"

باورچی ایک دم چنگھاڑا ــ "میں کیسے بتا دوں۔ مجھے کس طرح معلوم ہو۔"

وہ الٹے پاؤں باورچی خانہ میں چلا گیا۔

بلغم کی ٹکیا سے بھری وہ پلیٹ اس کے سامنے تھی۔ ہال کی تاریکی میں وہ محض ہاتھوں سے چھو کر ہی محسوس کر سکتا تھا۔ آخر ایسی کیا آفت تھی۔ ہاں۔ باورچی کو ایک ہی کوفت ہو سکتی تھی۔ جہاں سب برتنوں کو وہ ایک چھوٹی بالٹی کے پانی میں بھگو کر اور ایک چیتھڑے سے پونچھ کر رکھ دیتا تھا۔ اس پلیٹ کو صاف کرنے کے لئے اسے اپنے اصول

کے خلاف بالٹی کے گندے کیچڑ کو پلیٹ پر ڈالنا ہوگا اور پھر اسی کپڑے سے پونچھ کر رکھنا ہوگا۔ اتنی سی بات کی خاطر اس کا طیش اور جوش بیکار معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اتنا کام نہیں کرنا چاہتا تھا تو وہ خود بالٹی میں سے ایک دو چھینٹے چلو بھر پانی کے پلیٹ پر ڈالنے کے لئے تیار تھا۔

یکایک اسے بھوک لگی ——— وہ اندر باورچی خانے میں آگیا۔ دو تین پتیلیوں میں ایک ترکاری ایک دال اور گوشت کی بدذائقہ بدبو تھی۔ اول تو اس کھانے میں کوئی خوبی نہ تھی اور اب آدھی رات گئے جب محض کھرچن باقی رہ گئی تھی، اس نے ان پتیلیوں میں جھانکا اور ملتجی نگاہوں سے باورچی کو دیکھنے لگا جو اس کے لئے لاپرواہی سے دال ایک پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ "ایک دو بوٹیاں بھی رکھ دو۔"

ایک دو بوٹیاں پلیٹ میں پٹخ کر اس نے ٹھنڈی اور گیلی انگنت روٹیوں کو اس کے لئے دوسری پلیٹ پر رکھ دیا۔ وہ نہایت خفگی سے اکڑا کھڑا تھا۔ بوائے یا منیجر نے اپنے کھانے کے برتن اٹھا کر باہر جانے میں مصلحت سمجھی۔ ایک کونے میں جہاں باہر کی سیاہی اور مدھم لالٹین کو وہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اپنا کھانا لئے وہ آبیٹھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ باورچی اکڑا ہوا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ "ایک روپیہ دو میں ایک پلیٹ کہیں سے گوشت کی منگاؤں۔"

اس نے اپنے سامنے پڑی پلیٹوں میں دال اور دو ایک بوٹیوں کو بغور دیکھا اور ہچکچا کر کہا۔

"کافی گوشت ابھی ہوگا۔"

"تم ہمیشہ ایک ہی بات کہو گے۔" باورچی چیخا۔ "میں نہیں کھاتا۔"

اس کے ہاتھ جھٹ جیب میں سے روپیہ کا نوٹ نکال کر اسے پیش کر رہے تھے۔

اس نے پھر بھی کہا۔

"میں تو کھا رہا ہوں۔" غلیظ پلیٹ کو اٹھا کر باورچی جا چکا تھا۔

کیا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک روپیہ، اٹھنی ہی سہی، اپنے لئے خرچ کر سکتا۔ لیکن وہ نوٹ اس کی جیب میں بےحد محفوظ تھے۔ کیونکہ یہ اس کی دائمی کمزوری تھی۔ اور باورچی اپنے پکائے سالن کو اپنے لائق نہیں سمجھتا تھا خود اسے گھن آتی تھی۔ وہ نقشے پر نقشے نگھتا گیا۔

یکدم قدموں کی چاپ کے ساتھ ایک گاہک لالٹین کی مدھم روشنی میں آوارہ روح کی سنجیدگی مستی لاپرواہی کے ساتھ ٹکٹکی باندھے ہال کی سیاہی میں نیم خوابیدہ نگاہوں سے ٹٹولنے لگا تھا۔ اگر سارا دن آمدنی اتنی اچھی نہ ہوتی تو اب ایک گاہک اور کھڑا تھا۔ اس کھرچن میں سے، جسے وہ بیکار سمجھتے تھے ایک پلیٹ سالن اور چند ٹھنڈی تقریباً باسی روٹیاں اس کی جیب کی مالیت میں اضافہ کرنے کو تھیں۔ بیوپار اور خاص طور پر ایسی تجارت جو وہ کرتے تھے کسی حد تک مشکل یا فائدہ مند ہو سکتی تھی۔ سارا دن بلکہ کئی روز تک ہو سکتا تھا۔ کہ ان ترکاریوں اور دالوں اور گوشت کی قیمت بھی آمدنی سے پوری نہ ہو سکتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کھرچن سے ہی چند سکے ایک جیب سے دوسری جیب میں پھسل آئیں۔ وہ کھرتی سے اٹھ کر چلایا۔ "اندر آیئے۔"

گاہک چونک کر پیچھے ہٹا اور پھر اندر آ گیا۔ اس نے ٹوپی ایک میز پر پٹخی اور مختصر پوچھا۔ "کھانے کو کچھ ہے ——" یہ فقرہ ایک حکم تھا اور ان کے دیگچوں کی تفصیل کے بارے میں ایک سوال تھا اور اتنی رات گئے ان کی میزبانی کا امتحان تھا۔ اور انہیں کمائی کرنے کی ایک دعوت تھی —— اور نفی کی صورت میں وقت ضائع نہ کرنے کا ایک اعلان تھا —— اور وہ ایک کرسی میز پر سے اٹھا کر بیٹھ گیا۔

بوائے یا منیجر نے باورچی کو زور سے پکارا اور ساتھ ہی مہمان کو تسلی دی۔ "سب کچھ موجود ہے۔"

گاہک نے جمائی لی۔ "لاؤ پھر —" اس نے انگڑائی لے کر پوچھا۔ "اگر میں نہیں آتا تو تم اس سب کچھ کا کیا کرتے تم جانتے ہو، دیر ہوگئی ہے۔ آج رات کوئی نہیں آئے گا۔"

اس نے انتہائی مہمان نوازی سے کہا۔ "یہاں سب چیزیں روز تازہ بنتی ہیں۔ ہم جتنا کھا سکتے ہیں۔ کھا لیتے، باقی پھینک دیتے۔" لیکن گاہک جواب سے پیشتر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ دونوں کہنیاں میز پر رکھے اس کی چکنی سطح سے میل کا ملیم سا ناخون سے کرید کرید کر گولیاں بنا رہا تھا۔ ایسی فضا، ایسے ماحول اور اس شغل سے وہ یگانگت محسوس کر رہا تھا۔

اس نے باورچی کو ڈھونڈنے اور کھانا لانے سے پہلے مہمان کی تسلی کے لئے آنکھ بچا کر اپنا پانی کا گلاس اور جگ اس کے سامنے رکھ دیئے۔ دراصل اس نے فی الحال محض ایک گلاس ہی پیا تھا۔ گلاس بھر کر پیش کیا۔ پیاسے شرابی کی طرح وہ گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں پی کر مونچھوں کو صاف کر کے میل کی گولیاں بنانے کے شغل میں پھر مصروف ہو گیا تھا۔

لپک کر بوائے اندر باورچی خانے میں پہنچا۔ باورچی ابھی گوشت کی پلیٹ لئے لوٹا تھا۔ خوشبو اس کے نتھنوں میں سے ہوتی ہوئی اس کے ذہن کو مست کرنے لگی۔ اسی وقت وہ ساری پونجی ایک ایسے لقمے کے لئے دینے کو تیار معلوم ہوتا تھا لیکن اس نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "گاہک ہے۔ پھلکے اور ترکاری یا گوشت —— جلدی۔"

ایک گاہک کا اعلان یا کھانے کی تفصیل ہی ہوتی تو اور بات تھی لیکن آخری ایک فضول اور فالتو لفظ "جلدی —" نے قیامت مچا دی۔ جلدی۔؟ وہ جلدی کیوں کرے، کس لئے کرے۔ اس وقت آدھی رات کے وقت جلدی کیوں ہو۔ وہ اپنا کھانا ٹھنڈا اور بدذائقہ کرے۔ باورچی نے اسے یہ سب کچھ پوچھا۔

بوائے یا منیجر خود ہوٹل کا انتظام کر سکتا تھا۔ وہ گاہکوں کے گندے برتن اٹھا سکتا تھا۔ وہ غلاظت بھی دھو دیتا اور فضول خرچی کے لئے دو پیسے کا نوٹ دینے سے دریغ نہیں کرتا تھا لیکن اس بات کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے باورچی کو ایک موقعہ دیا اور خود خاموشی سے باہر آگیا۔ گاہک بدستور میز کی میل کھرچ رہا تھا۔ جگ خالی ہو گیا تھا۔ اس نے پھرتی سے جگ اٹھایا۔ پانی پینے کے لئے اس نے باورچی خانے کے مٹکوں اور کنستروں کو ٹٹولا۔ لیکن پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ برف کا پگھلا ہوا پانی اس کی نظروں میں آگیا۔ اس نے سب طرف کسی کپڑے کو ڈھونڈا تاکہ مچھروں، پتنگوں، تنکوں کو چھان لے --- کپڑا سوائے اس چیتھڑے کے اور کوئی نہ تھا جس سے وہ برتن مانجتے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی جیب سے گندے رومال کا ٹکڑا نکالا اور ٹھنڈا پانی چھان کر جگ میں ڈال دیا۔ گو رنگت زرد زرد تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی وجہ محض برف کی فیکٹری کی لاپرواہی تھی جو برف صاف پانی سے نہ بنانے کی کوشش ہی نہ کرتے تھے لیکن گاہک نے وجہ نہیں پوچھی۔

اس نے لپک کر ٹماٹروں اور پیاز کے ٹکڑوں کو جمع کیا۔ وہ پلیٹ میں ڈال کر سے ہی جاتا لیکن باورچی کی مضبوط گرفت نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

"وہ برتن میں نے صاف کر کے رکھے ہیں۔"

"تو میں کیا کہتا ہوں ---" اس نے احتجاج کیا۔

"میں بار بار صاف ہی کرتا رہوں گا؟" اس نے سوال کیا۔ "یہ لیجاؤ۔ کھلا دو کھانا۔" اور وہی غلاظت بھری پلیٹ اس نے آگے سرکا دی جو اسی چیتھڑے سے صاف ہو گئی تھی۔

خاموشی سے اس نے ٹماٹروں اور پیاز کے چھلکوں کو جمع کر کے اس میں رکھا اور باہر لے آیا۔ وہ گاہک اب کچھ پریشان ہونے لگا تھا کھانے کے آغاز

نے اسے پھر اطمینان بخشا، اور وہ پیاز کے لچھوں اور ٹماٹر کے ٹکڑوں کو وقت گذارنے کے لیے کھانے لگا۔ اب سالن اور روٹیوں کے آنے میں تاخیر کا کوئی بہانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بوائے یا منیجر کو اب اس بد انتظامی پر طیش آنے لگا۔ اس نے جیب ٹٹولی جیب کی کل جمع پونجی اوسط سے بھی کم تھی اور ایک قیمتی گاہک سے یہ بے رخی اسے بجد تعجب خیز اور بد ذوق محسوس ہوئی۔

باورچی خانے میں اس نے باورچی کو گیلے اور پکے کچے چھلکوں کو سینکتے پایا۔ اس نے ایک گندی پلیٹ کو چیتھڑے سے پونچھ ڈالا اور ہمدردی سے کہا۔ "بس ٹھیک ہے۔ بہت گرم بھی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔

"بس یہ صحیح ہے۔"

لیکن باورچی ایک پاپڑ کی طرح روٹی کو بھون رہا تھا۔ اس کی ہمدردی سے باورچی کے ہاتھوں کی جنبش اور روٹی کی حالت بجد ناگوار ہو رہی تھی۔

وہ صبر سے دیکھتا رہ گیا۔ باورچی نے سلیقے سے ایک صاف پلیٹ میں چپاتیاں رکھ کر اپنے سامنے دستر خوان بچھا لیا۔ اور کھانے لگا۔

خود اس نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا تھا اور اپنے کھانے میں بدذائقہ اور بدبودار دال اور ایک دو چھیچھڑے گوشت کے تھے۔ جو پتھر جیسے چھلکوں سمیت ٹھنڈے اور بد ذائقہ ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نقمے کے ذرے وہ اب تک دانتوں سے کرید رہا تھا۔ اور باورچی ایک دولت مند سوداگر کی طرح مزے لے کر ایک روپے میں گوشت کی ایک پلیٹ لا کر بے فکری سے کھا رہا تھا۔ حالانکہ ایک گاہک مہمان باہر بیٹھا اس انتظار میں تھا کہ چند لمحوں میں تازہ روٹیاں اور لذیذ سالن پیش ہوگا۔ گو جیسے چھلکے اور سالن وہ لے کر جا رہا تھا۔ وہ مختلف بات تھی۔

ایک منیجر کی حیثیت سے یا ایک بوائے کے فرائض کے مطابق اس نے اپنا اہم پارٹ ادا کرنے کی کوشش کی۔ "تم کیا کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "یعنی باہر ایک گاہک بیٹھا ہے اور تم ——"

"وقت کیا ہوا ہے۔؟"

"میں نہیں جانتا وقت کیا ہوا ہے۔ تم بتا دو۔ وقت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک گاہک بیٹھا ہے اور تم۔"

"چولہے میں آگ ہے۔؟"

"میں نہیں جانتا کہ آگ ہے یا نہیں۔"

"سب باتیں میں کیسے بتا دوں۔؟" باورچی نے ایک گلاس پانی پیا۔

"ذرا پانی دینا۔"

وہ اسی چھانے ہوئے پانی کو لے آیا۔ اس نے خوشگواری اور بہتر فضا کو قائم ہوا دیکھ کر فائدہ اٹھانا چاہا۔ "چلو —— اٹھو بھی گاہک بیٹھا ہے۔"

باورچی نے پھر پانی طلب کیا۔

باہر حال میں سے ہلچل کی آواز آرہی تھی گاہک واقعی اب تک پریشان بلکہ بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ "آیا صاحب۔ ابھی گرم گرم روٹیاں۔ ابلتا ہوا گوشت۔"

لیکن وہ روٹیاں تھیں اور گوشت کے محض چھیچھڑے تھے جن پر شوربہ اور تیل کی چکنائی جمنے لگی تھی۔ اس نے ایک میلی کچیلی پلیٹ میں گوشت کے سب چھیچھڑے ڈال دیئے اور ادھ بجھی ہوئی آگ کے پاس سینک کے لئے رکھ دیا۔ پھرتی سے اس نے باورچی کے سامنے رکھے پھلکے اٹھائے۔ اس پلان کے لئے دیر سے وہ اپنے جذبات کو قابو میں کر رہا تھا۔ اور جرأت کو پکار رہا تھا۔ اب اس نے وہ سب روٹیاں

اٹھالیں اور باہر بھاگا۔

وہ ابھی باورچی خانے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ باورچی کے مضبوط اور تنومند بازو اسے اپنی گرفت میں لئے پیچھے گھسیٹنے لگے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "ارے بھائی جانے دو۔۔۔ شوربہ بہہ جائے گا۔ اور روٹیاں گر جائیں گی۔"

لیکن وہ جابرانہ گرفت سخت ہو رہی تھی۔ اب وہ دونوں باورچی کے دسترخوان کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ باورچی نے ایک جھٹکے سے ایک ہاتھ سے روٹیاں چھین لیں۔ درد سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے سنجیدگی سے باورچی کے چہرے کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک بدوضع چمک تھی۔ وہ ایک بار لرز گیا۔ "تم اور پکا لینا۔" اس نے سہمے ہوئے کہا لیکن باورچی دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گیا تھا۔ اس نے ایک کہنی سے اسے دھکیل دیا۔ "جاکر اپنے گاہک کے لئے پکالو۔"

وہ درد، خوف اور حیرت کا مرقعہ بنا اس اچانک سلوک کے دھچکے سے سہما ہوا ہال میں آگیا۔ اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ گاہک وہاں نہیں تھا۔ ٹماٹروں اور پیاز کے لچھوں والی غلیظ پلیٹ تقریباً خالی ہو گئی تھی۔ پانی ختم ہو چکا تھا۔ اور گاہک آخر چلا گیا تھا۔ اسے تمام واقعہ میں پہلی بار اطمینان ہوا کہ گاہک کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ کیا عذر پیش کر سکتا تھا۔ یا کیونکر کھانا مہیا کر سکتا تھا۔ پھر اسے اپنی چپاتیاں نظر آئیں اور وہ باہر گاہک کو ڈھونڈنے بھاگا۔ آخر ان روٹیوں سے کم از کم وہ آٹھ آنے وصول کر سکتا تھا۔ اور اس کی جیب میں روزانہ خرچ کے نکالنے کے بعد باقی نفع کیا بچا تھا۔۔۔؟ محض ایک روپیہ اور بارہ آنے۔ یعنی چھ وہ آنے فی کس اور سوچنے کی بات تھی کہ چھ وہ آنے سے کیا بنتا تھا جبکہ ان کے کنبے تھے اور بیسیوں فضول رسم و رواج تھے جن کے لئے معقول رقمیں چاہیئیں تھیں۔

گاہک اسے تاریک اور خاموش سڑک پر چلتا ہوا ملا۔ اس نے شکایت کی۔

"آپ آ گئے۔ اور ہم نے کھانا تیار کر کے میز پر رکھا اور آپ کا انتظار کر رہے تھے"۔

گاہک رک گیا۔ اس نے ضدی بچے کی طرح بسور کر کہا۔ "میں نہیں جاتا"۔

لیکن وہ گاہک کو کیسے جانے دیتا جبکہ مزید چھ یا آٹھ آنے نفع میں چار آنے فی کس کا اضافہ کر کے چودہ آنے سے ایک روپیہ دو آنے کی باعزت اور واجب رقم بن سکتی تھی ــــــ اور گاہک چلتا گیا۔ "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے حکم دیدیا تھا"۔ اس نے احتجاج کیا۔

"نہیں۔ میں نہیں آتا۔" نفی میں سر ہلا ہلا کر وہ شخص کہتا گیا۔ "میں نہیں آتا۔"

گاہک کے بغیر اسے لوٹنا پڑا۔ ایک غم، احتجاج، غصہ لئے اسے واپس آنا پڑا۔ باورچی کھانا کھا کر ایک عام فہم گیت، مست آواز سے گا رہا تھا۔ وہ پاس کھڑا کڑھتا رہا۔ اس کے دانتوں میں اب روٹی کے ذرّے بھی نہ رہے تھے۔ وہ اس لاپرواہ شخص کو ستانا چاہتا تھا۔ "آج کی تمہاری آمدنی محض چودہ آنے ہے۔ کر لو۔ کیا کرتے ہو ـــ۔"

گیت کی لے اونچی ہو گئی۔ اس شخص کی مستی حیرت انگیز تھی اور اس کا کڑھنا تعجب خیز تھا۔ جبکہ باورچی ایک روپیہ کی گوشت کی ایک پلیٹ کھا سکتا تھا اور وہ میٹھا اس کی صورت ہی دیکھتا رہ جاتا تھا۔ اور پھر وہ آمدنی کو لطف بانٹ لیتے تھے۔

وہ جوش اور غصے میں اٹھا، کڑھتے ہوئے وہ پاس کی دوکان میں پہنچا اور اس نے تازہ لذیذ چپاتیاں گوشت کی ایک پلیٹ اور ترکاری جی بھر کر کھائی۔ جو دو آنے بچے اس نے سگریٹ اور پان پر خرچ کر دیئے اور پھر اس نے دوسرے مشہور گیت کی طرز وثوق سے گائی۔

بوسیدہ تاریک ہال میں گنگناتے ہوئے اس نے باورچی کو فاتحانہ مسکراہٹ سے ملنا چاہا، لیکن اس کی بلند پایہ دھن سے بے خبر، باورچی میٹھی نیند کے خراٹے لے رہا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کو پھیپھڑوں کی حدود تک جذب کر کے اس نے بغور سوتے ہوئے آدمی کو دیکھا اور خالی جیب کا شفاف تصوّر سیاہی میں نمودار ہوا۔
اس نے بستر لپیٹ کر بغل میں دبایا اور رفوچکر ہوگیا۔

فخر کی بات

اسے چھینک آئی بغیر کسی بیم یا احتیاط کے اس نے چھینک دیا۔ اسے بخار یا زکام نہیں تھا۔ چھینک ویسے ہی آگئی تھی جیسے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے یاد کرنے پر آجاتی ہے۔ دھوتی کے پلّو سے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جو اسی وجہ سے گیلے گیلے ہو گئے تھے پونچھ لیا۔ منہ صاف کرتے ہوئے اس نے پھر اسے دیکھا۔

"تو تجھے چھٹی چاہیئے۔"

"جی مالکن۔"

اسی طرح آدھے گھنٹے کے لگ بھگ ہاتھ جوڑے وہ کھڑا رہا۔ اب اسے اس بات سے آگاہی ہوتی تھی۔ کہ اتنی دیر کھڑا رہنے اور درخواست کرنے کا اثر کچھ نہیں ہو سکا یا مالکن نے اس کی لمبی چوڑی باتوں کو سنا ہی نہ تھا۔ دوبارہ ذہنی کاوشوں کو سرگرم کرنے کی صورتیں اس کے چہرے پر عیاں ہونے لگیں۔ وہ دوبارہ درخواست کرنے کے لئے زیادہ پُر زور الفاظ بنا رہا تھا۔ وہ موقعہ تلاش کر رہا تھا کہ اس بار مطلب

صاف ظاہر ہو جائے اور مالکن ایسی بے سروکاری سے وجہ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے

مالکن نے یہ سب کچھ جانچ لیا۔ اس نے برآمدے میں دیوار کے پاس تھوک کر کہا۔ "تو

تجھے چھٹی آج شام کو چاہیئے۔"

اس کا مطلب تھا کہ مالکن نے اس کی باتیں سن لی تھیں۔ اس نے زیادہ گڑ

گڑاہٹ اور ہوشیاری سے کہا۔

"جی مالکن۔"

تو اب دوبارہ وہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی درخواست کو دہرانے

کی جگہ گویا اسے اب محض اس بارے میں زور ڈالنا چاہیئے تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس

کی باتوں کو سنکر مالکن اب چھٹی دینے کے مسٔلہ کی اہمیت کو ترازو میں تول رہی تھی۔ اب

کی بار پھر اس کے چہرے کے اعضاء کی کیفیت تبدیل ہوئی۔ اس بار حالت فریاد کرنے

کے انداز کی تھی۔ مالکن نے یہ بھی جانچ لیا۔ اس نے یہ بالکل بیکار سمجھا۔ چنانچہ منہ دوبارہ

دھوتی کے پلّو سے اچھی طرح پونچھ کر اس نے اپنی نظریں اس پر گاڑ دیں۔ بار بار رگڑنے

سے چہرے پر سرخی آگئی تھی۔ خاص طور پر ہونٹوں کے اردگرد جہاں سبزہ کافی تھا۔

"مالکن —— جی ——" اس نے پھر اہمیت کا اظہار کیا۔

"بھئی، ایسی بھی کیا بات ہے کہ تم دو منٹ کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔"

مالکن نے اب صحیح طور پر ناراضگی اور نارضامندی ظاہر کرنی چاہی۔

یہ کیسی عجیب بات تھی۔ سب مالکنوں نے یا مالکوں نے تھوڑی بہت گفتگو

کے بعد اجازت دے دی تھی لیکن یہ مالکن بڑی ظالم تھی۔ اس نے آنکھوں میں

آنسو بھر کر کہا۔ "مالکن جی! ایک دن کی بات ہے۔ پھر تو کبھی مجھے ضرورت نہ ہوگی۔

آج سارے مہمان آجائیں گے، برادری ہوگی، شور مچے گا۔ شگون کا خیال تو کرنا ہی

پڑتا ہے۔ اگر آج بھی صاف کپڑے نہ پہنے تو کتنی بری بات ہے۔"

لیکن مالکن کا چہرہ بالکل اسی طرح سخت تھا۔ یقیناً کوئی اثر نہیں ہوا ہوگا۔ کیونکہ اس کے ہونٹوں کے نزدیک خاص طور پر اوپر کے ہونٹ پر جیسے سنہرے میں فرعونیت تھی، بکر خنگی تھی۔ اس نے گول گول آنکھوں کو پھیلا کر برا مانتے ہوئے کہا۔ "تو کام کون کریگا۔"؟

"میں کل دوگنا کام کر دوں گا۔"

"اور آج۔"

"آج تو مالکن جی۔"

"پیسے کاٹوں گی۔ آج کے پیسے۔" مالکن نے دانتوں کو کھرچ کر ہیک ماری۔

"صبح تو میں سارا کام کر گیا تھا مالکن جی۔" اب اصلی آنسوؤں کا آنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس کا جواب ایک جھنکھاڑ سے دیا گیا۔ مالکن کے کلیجے کے نرم ترین کونے میں یہ بات ایسی چبھی کہ اگر وہ فرعونی تخت پر فروزاں ہوتی اور عدالت یا پولیس کا ڈر نہ ہوتا تو وہ پاس پڑی سبزی کاٹنے کی چھری سے اسی بھنگی کی رگ رگ کاٹ یا نوچ لیتی۔ کم ذات بھنگی کو چھٹی کا خیال آگیا تھا۔ ان بد ذات ہندوستانیوں کو بھی اب روپے پیسے کے معاملے میں اپنی رائے بلکہ گفتار کا حوصلہ ہو گیا تھا...... لیکن وہ بھنگی اس کی اپنی جائیداد نہ رہا۔ بیسیوں گھروں میں کام کر کے اس کے ذہن دماغ، ضمیر کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ غریب مالکن اب کیا کرتی۔؟ اس نے جھنگھاڑ کر بات منوانے کی کوشش کی لیکن اب ایک روز کے پیسے کاٹنے کی بھی اسے اجازت نہ تھی۔ آواز کی تیز ترین اور انتہائی اونچائیوں میں وہ نجانے کن الفاظ اور کس زبان کا استعمال کرتی رہی۔ محض اس کی آواز کی روانی سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ چھٹی کے خلاف تھی۔

بھنگی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔" مالکن جی۔ اگر آپ نے چھٹی نہ دی تو مجھے دیر ہو جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔" پھر اس نے اپنے انتہائی غلیظ ہاتھوں سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو صاف کیا کیونکہ وہ اب کافی دیر سے رو رہا تھا۔

"جاؤ ___ جاؤ ___" مالکن نے گھٹی، اونچی آواز سے کہا۔ "پیسے کاٹوں گی، ضرور کاٹوں گی۔"

"میں غریب آدمی ہوں۔" وہ آنکھیں غلیظ انگلیوں سے رگڑتا اور پونچھتا گیا۔

"غریب آدمی اس طرح بولتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "دو منٹ کا کام ہے۔ کر جانا ___ جاؤ ___ جاؤ ___"

کوئی چارہ نہ تھا، وہ چلا گیا۔

یہ تو بڑی مشکل ہوتی۔ وہ شام کو اگر کوڑا اور گندگی کے ڈھیر اٹھاتا رہا، تو اس کی شادی کے روز یہ کیسی بری بات ہو گی۔ ایسی بری بات کے بارے میں وہ سوچ کر ہی رہ گیا۔ کیا اسے واپس جا کر مالکن کی زیادہ خوشامد نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک بار تو اسے رحم آ گیا تھا۔ لیکن شاید اس کی ادائیگی میں کوئی نقص رہ گیا ہو۔ شاید اسکے اپنے الفاظ یا اداکاری میں غمناک تصور نہیں آ سکا تھا۔ خیالات کے اس دوراہے پر پہنچ کر وہ سوچنے لگا کہ کوشش کی ضرورت ہے یا نہیں۔ وہ سیڑھیوں پر کھڑا کبھی ناک کبھی منہ اور گلے کو مستا رہا نیچے سے کسی کے آنے کی آواز نے اسے جلد فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ خوشامد بیکار سمجھ کر اس نے چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ جب تک اجنبی اوپر پہنچ جائے، اس وقت تک وہ دروازہ میں کھڑا رہا۔ وہ گھر کا مالک تھا جس کی سست چال اور بجھا بجھا چہرہ اور کاہلیت سے بھری آنکھیں اور ہاتھوں میں پکڑے کاغذ دل کے پلندے میں بیزاری رہتی تھی۔ وہ بولتا بھی ڈھیلے انداز سے تھا اور ہنستا اور مسکراتا

ہوا بھی بوریت میں غرق رہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "کیوں تو آج اتنی دیر تک کام نہیں کر سکا۔"

اس کی آواز میں درشتی تھی نہ ہمدردی نہ ہی غصہ یا رنج یا ناراضگی کے آثار تھے۔ اس کے یہ الفاظ فضا میں اس طرح گم ہو گئے تھے جیسے اس نے اکیلے پن میں ایک بات کو محسوس کر کے با آواز اپنا معمولی ردِ عمل ظاہر کیا ہو۔ چھوٹے آدمی کی آنکھیں پھر سرخ ہو گئیں۔ اس نے آہستہ کہا۔ "بابو جی! آج شام کی چھٹی مانگنے آیا تھا جی۔ میں نے اب تک کبھی ناغہ نہ کیا تھا جی۔ آج کرنا پڑے گا۔ لیکن مالکن جی مانتی نہیں ہیں جی۔"

"چھٹی۔" تھکے ماندے بابو نے اسی بے سروکاری سے دہرایا۔ "چھٹی کیوں مانگتا ہے تو۔"

اس کے الفاظ میں واقعی کوئی اثر نہیں ہو گا۔ ورنہ وہ بابو بھی اسی روز اس نیند کے خمار میں کر خستگی بھر لایا تھا۔ اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "آج میری شادی کر رہے ہیں۔"

"تیری شادی ۔۔۔" بابو نے آنکھیں کھولنے کی ازحد کوشش کے بعد کہا۔ "تو چھٹی لے لے۔"

"چھٹی مالکن نہیں دے رہی ہیں۔ باقی سب نے دیدی ہے۔"

"جا ۔۔۔ جا ۔۔۔ شادی ہے تو چھٹی مل ہی جائے گی ۔۔۔ تو نے یہ نہیں کہا ہو گا ۔۔۔ جا۔۔"

وہ ہاتھ جوڑے زینہ سے اتر گیا۔ تو گویا اس شام وہ واقعی آزاد تھا۔ اس لمحہ کے بعد گویا اسے کسی بات کا خطرہ نہ تھا۔ اس نے مکانوں کے بلند ترین حصوں کو دیکھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ کیونکہ اس دن وہ فارغ ہو کر زندگی کی مقدس ترین رسوم کو ادا کرنے کے لئے اب تیار تھا۔ جب وہ اس آخری مالکن سے چھٹی مانگ

کے لیے گیا تھا تو اس کی آرزو تھی کہ نیچے اتر کر وہ پورے زور سے سیٹیاں بجائے گا۔
اسے سیٹی بجانے میں ایسی مہارت نہ تھی کہ فلمی گیتوں کو ادا کر سکتا لیکن وہ مزے سے
محض سادہ سیٹی بجانے کا شوقین تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ گھر پہنچنے تک اپنی خوشی
تسلی اور شادمانی کا اظہار اسی طرح کریگا۔ لیکن اب وہ اس قابل نہ تھا۔ اتنی دیر
تک خوشامدیں، منتیں اور درخواست کرنے کے بعد اب چھٹی اور آزادی کی وہ مسرت
نہ رہی تھی۔ اب وہ چاؤ نہ تھا۔ اس نے ایک اور گہرا سانس لیا۔ اس وقت اسے
اتنی مشکلوں کے بعد ملی چھٹی بیکار اور بے بنیاد لگنے لگی گو شادی کی رسم بے حد
ضروری تھی۔ اس کے والدین اور کئی رشتہ دار اسی وجہ سے مہینہ بھر سے اس کے
یہاں آچکے تھے۔ رات بھر وہ اس خوشی میں گیت گایا کرتے تھے۔ سارا سارا دن وہ
شادی کے پروگرام بنایا کرتے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی بھی بے حد
خوش تھے۔ اس روز وہ سب نہا چکے تھے۔ یہ خواہش اس کی اپنی تھی حالانکہ چھوٹے
چھوٹے بچوں کا نہانا اتنا ضروری نہ تھا۔

اس کی ماں اور باپ بھی نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کے آنے اور
رہنے اور کپڑوں زیورات کا خرچ سب کچھ اسی نے دیا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کا
اتنا خرچ نہ تھا۔ اور اب جس لاپرواہی سے انہوں نے رقم خرچ کرنی شروع کی تھی۔
ان کی ساری برادری، سب رشتہ دار اور دوست ان کے گرویدہ ہو گئے۔ فریفتہ
ہو گئے اور یہی وجہ تھی کہ اب دوپہر کے ۲ دو بجنے کو تھے اور مہورت شام کے آٹھ
بجے شادی کی رسوم کے لئے مقرر ہوا تھا۔ لیکن وہ سب ابھی سے اس کے ایک کمرے
اور چھوٹے برآمدے پر مشتمل مکان میں بھر گئے تھے۔ اور دعوتیں کھا رہے تھے اور
حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ اور خوشی خوشی وہ چند ساعتیں گزار رہے تھے۔ اور
اب خود دولہا ان کے درمیان تھا۔ عورتیں سارے ارمان، خواہش، امیدیں۔

آرزوئیں لئے پرشگون گلے گا رہی تھیں۔ کیونکہ اتنے خوبصورت اور امیر دولہا کی فراخدلی کو دیکھ کر وہ اس کی ساری عمر خوشحالی کی دعائیں کرتی تھیں اور اپنے جذبات کو نغموں کی تانوں میں پیش کر رہی تھیں۔ اور وہ ایک میلی دری پر بیٹھا تھا۔ جو اسے اس گلی کے پانچویں مکان کی مالکن نے دیدی تھی کیونکہ ننھے نے کئی بار اپنی نادانی اور معصومیت میں اسے غلیظ کیا تھا۔ اور خود مالکن اس غلاظت کو دھونے اور صاف کرنے سے قاصر رہی تھی کیونکہ وہ سو جانے کی عادی تھی اور ننھا اسی دری کو اپنے اہم شغلوں کیلئے چن چکا تھا۔ چنانچہ جب گندی دری برداشت سے گذر گئی تو اسے مل گئی اور اس نے بیت الخلا کی سب نشانیاں کھرچ اور مٹا کر اپنے لائق کر لیا۔

آج اس مقدس، پاک اور اہم موقعہ پر وہ دری اس کی مایہ ناز جائیداد ثابت ہوئی۔ اور دیکھنے والے اسے اس کی قسمت اور اس کے فراخدل مالکوں کو سراہتے ہوئے آخر اس کی بیوی کے نصیبوں کو سوچنے لگے تھے۔

چنانچہ وہ ایک میلی دری پر بیٹھا تھا اور اپنے گھر کی نفاست، اور قرینے کو دیکھ رہا تھا۔ شام کے چھ بجے تک اسے وہیں اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات کرنی تھی اور خاموشی سے ان کے مذاق، قہقہے اور طنز سننے تھے۔ اس کا گھر اپنی رونق کو لئے اس ساری گلی میں افضل نظر آ رہا تھا۔ مالکوں کے گھروں کے نزدیک ہی رہنا اس کے لئے ایک اور عزت اور قدر کی بات تھی۔ کمرے میں تمام چیتھڑوں کو اس کی ماں نے ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ دیواروں پر اس کے نئے کپڑے لٹکے ہوئے تھے جو اس نے اس موقعہ کے لئے بازار سے بنوائے تھے۔ صابن کی آدھی ٹکیا وہ ان مالکوں کے یہاں سے لے آیا تھا۔ جن کے یہاں تین مہینے ہوئے ایک دق کے مریض نے روح چھوڑی تھی۔ اس وقت سے اس نے وہ آدھی ٹکیا چھپا چھوڑی تھی کیونکہ وہ شادی کے روز استعمال میں لا کر سب کی نگاہوں میں رشک پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس مریض کا اسے اور بھی بڑا فائدہ

ہوا۔ ایک چلمچی جس میں مریض محض تھوکا کرتا تھا، مفت میں اس کے ہاتھ آگئی۔ چند ایک برتن جو خاص اسی دق کے مریض کے تھے جن میں کانچ کا ایک عمدہ گلاس تھا اسے مل گئے ۔۔۔۔ ان برتنوں کو اس نے آج استعمال کیا تھا۔ کیونکہ وہ سب کو کانچ کے عمدہ گلاس میں پانی پی کر حسد پر آمادہ کرنے میں بجید مزا پانا چاہتا تھا۔ پھر اسے کپڑے بھی ملے تھے جو اس نے اپنے بستر پر اس روز بچھانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ چادریں۔ لحاف اور دری بالکل نئی ہی تھی۔ مریض کے ذاتی کپڑے اس نے نئے صندوق میں بند کر دیئے تھے۔ وہ اب صحیح طور پر زندگی کا لطف اٹھانے کی تیاریاں کر چکا تھا محض ان رسومات کے ختم ہونے کی دیر تھی۔ اس نے ایک اور نظر اپنے کمرے میں ڈالی۔ آخر وہ کن اشیاء کو یاد کرے۔ اس کے گھر میں ایسی بیسیوں چیزیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ اس کی بیوی دراصل بہت قسمت والی ہو گی۔ اسے خود معلوم تھا۔

اب عورتوں نے نہانے کا پانی کافی جمع کر لیا تھا۔ اب اسے نئے کپڑے پہنانے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سب اس کے گرد جمع ہو کر اس سے ہر قسم کے مذاق کر رہے تھے۔ وہ ایسے حالات میں اپنے دل میں بے حد فخر کرتا تھا۔ وہ ان لمحات کو بڑی خوشی اور مستعدی سے نبھا رہا تھا۔ عورتوں کے گانے میں زیادہ جوش و خروش اور جذبات ابل رہے تھے۔ مردوں کی ہنسی اور مذاق حد تک تجاوز کر رہے تھے۔ اور وہ سب ہی خوشی اور محبت سے اس کے جسم میں گدگدیاں اور چٹکیاں لے رہے تھے۔ اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ وہ کپڑے اتار کر نہانے کے لئے جانے لگا۔ پُر شگون گانے اور ان کی ایک سی تانوں اور ڈھولک اور نغموں کی آوازیں بہت زیادہ ہو گئیں ۔۔

عین اسی وقت گلی کے دوسری جانب ایک مکان سے کسی نے اسے پکارا ۔۔۔ لیکن اس کی ماں نے شگون کی خاطر گانا بند نہ کیا ۔۔۔۔ آواز بلند

سے بلند تر ہوتی گئی۔ کوئی بڑے غصہ اور سختی سے اسے بلا تا رہا۔ اس نے کہا۔ "میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں کون ہے۔"

"نہیں نہیں۔" اس کی ماں نے کہا۔ رشتہ داروں نے کہا اور سب نے اونچی آواز سے کہا۔ "شگون۔"

جب وہ اس مقدس رسم کے لئے کپڑے اتار چکا تھا اور اس پاک رواج کے لئے تیار ہو چکا تھا تو نہائے بغیر باہر جانا ایک پُرغم اور خطرناک بات تھی۔

اس شور میں اس آواز کو وہ صاف صاف نہیں سن سکا تھا چنانچہ وہ بھی لاپرواہی سے وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا دل بھی بھوتوں اور خوفناک قصوں کے خیال سے دھڑکنے لگا تھا۔ اور عورتیں اس کے جسم پر جمی ازل کی میل کو اتارنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگیں۔ نغمے پھر اسی تیزی سے پھوٹنے لگے اور وہ آواز دور خلاء میں کھو گئی جیسے وہ چڑیل، بھتنی، بدروح شکست کھا کر آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی ہو جیسے ان پُرشگون گانوں نے اس کی خوفناک چیخوں کے سحر کو اتار پھینکا ہو۔

وہ نہا بیٹھا تھا۔ میل کافی اتاری گئی تھی اور اس کا جسم اتنا سیاہ نہ رہا تھا۔ اس کے گوشت اور پوست میں سے پھوٹتی بدبو میں اب دق کے مریض کے صابن کی آدھی ٹکیا کی خوشبو مل گئی تھی اور وہ اس تیز بو کو محسوس کر رہا تھا جس میں ایک نیا اثر تھا۔ عورتیں بھی اس خوشبو کو اپنے ہاتھوں میں پا رہی تھیں۔ ان کی ہتھیلیوں کی رنگت میں بھی سفیدی زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ نہا چکا تھا۔ کپڑے پہن چکا تھا۔ وہ تیار ہو کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے شرما کر خوش اخلاقی سے سنجیدہ ہونا چاہیے یا دل میں پھوٹتے ہوئے خوشی کے جذبات کے تحت ہنسنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ہنسی دبا رہا تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

پھر وہی نسوانی چیخ۔ وہ چڑیل کی خوفناک گرج سنائی دی۔ اور وہ قدرتی

تور پر دہل گیا - اس کا منہ سوکھ گیا، اس کی رنگت ویسے ہی سیاہ ہو گئی - ایک لمحہ میں اس نے پہچان لیا - وہ آواز اس کی مالکن کی تھی - وہ جانتا تھا، کونسی مالکن ہو سکتی تھی - وہ پہچانتا تھا کہ اس کا چہرہ اس وقت کتنا وحشی اور خوفناک ہوگا کیونکہ آدھے گھنٹے سے وہ بلند ترین آواز میں اس کا نام لے کر چیخ رہی تھی - اس نے اپنے اردگرد دیکھا - لوگ سب ہی حیران تھے - وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ نہ جائے گا - یہ آواز بند نہ ہوگی - جب تک وہ جا کر باتیں نہیں سن لیتا -

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا - وہ کانپ رہا تھا - وہ خوف سے لرز رہا تھا - وہ سہما ہوا تھا اور وہ بے حس اوپر جا رہا تھا - اپنی مالکن کے حضور میں جہاں سوائے گالیوں، جھڑکیوں اور طعنوں کے اسے اور کچھ سننے کی امید نہ تھی -

اس نے کہا - "مالکن جی - میری شادی ہے -"

"شادی ——" مالکن نے اس کی نقل عین ویسی ہی اتاری -

"مالکن جی -" اس کا گلا گھبرا گیا - "میں نہا رہا تھا جی - اور سب نے آنے نہیں دیا -"

"بھلا تو بچہ ہے - " مالکن اس کے بہانے سے خوب واقف تھی - "تم ان سے سے تنگا ہے -"

"وہ شگون کے لئے کر رہی تھیں جی - میرے نہانے کے لئے -" وہ مالکن کے بدشگونی کے الفاظ سن کر بھاگنے کے لئے بیقرار تھا -

مالکن نے اسے کئی اور سخت سست سنا ڈالیں - اس کے بس میں کیا تھا - وہ کیا کرتا - وہ ان سب کی سخت اور سست سننے کے لئے پیدا ہوا تھا - پھر وہ کیا کر سکتا تھا - وہ سنتا گیا - اس کے بد شگون کی دھجیاں مالکن نے اڑا دیں - پاس کے مکان کی مالکن نے بھی اس کے خلاف بولنا شروع کر دیا -

وہ ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ اس نے محض اتنا ہی کہا۔ "مالکن جی۔ آج میری شادی ہے۔"

مالکن اس کی بکواس برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ "اور صفائی کون کرے۔ تیرا باپ۔ تیری ماں۔ تیرے بڑے۔ تیرا خاندان۔"

چنانچہ چھٹی نہ ملی تھی۔ وہ کمزور، غمگین اور بیمار کلرک اب اندر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں یا اس میں ہمت نہ تھی یا وہ سو رہا تھا۔ چنانچہ اسے چھٹی نہ مل سکی۔ اسے غلاظت صاف کرنی تھی۔ وہ نہا کر آیا تھا۔ خوشبودار صابن استعمال کر کے آیا تھا۔ وہ نئے کپڑے پہن کر آیا تھا۔ وہ دولہا بن کر آیا تھا۔ وہ تمام شگون اور اچھے جذبات لے کر آیا تھا، لیکن اسے غلاظت صاف کرنی تھی اسے گندگی سے کھیلنا تھا۔ وہ انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اس کی روزی مالکن کے ہاتھوں میں تھی۔ کم از کم نئے کپڑے اتار کر تو کام کرتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس بات کا وقت نہ تھا۔ اس کی رشتہ دار عورتیں ایسا کبھی نہ کرنے دیتیں۔ وہ خاموش اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

وہ غلاظت اٹھانے اور گندگی صاف کرنے کے لئے چلا گیا۔ اس کے سر میں بہت کچھ ابل رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بہت کچھ جوش مار رہا تھا۔ اس کے دل میں انتشار برپا تھا۔ لیکن وہ چپکے سے اپنا کام کرنے چلا گیا۔ وہ اور کیا کرتا۔

اس نے غلاظت صاف کی۔ اس نے گندگی اپنے کندھوں پر اٹھائی جب وہ واپس آیا تو مالکن کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "بس، اتنی سی تو بات تھی۔ یونہی اتنی دیر لگا دی۔"

وہ نیچے اترنے لگا۔ یہ تسلی بخش الفاظ اسے تسکین نہ دے سکے۔ اپنے کپڑوں اور ہاتھوں کو دیکھ کر اسے اپنی شادی کا خیال بہت تکلیف دہ لگا۔ سیڑھیوں پر

ہی کھڑے ہو کر پہلے تو اس نے قمیص سے اپنی آنکھیں پونچھیں کیونکہ وہ ابال، جوش، انتشار اب آنکھوں کے ذریعہ بہنے لگا تھا۔ وہ سسکیاں لے کر وہیں کھڑا روتا رہا۔

"ارے تو کہاں گیا۔؟" سامنے کے مکان سے دوسری مالکن نے اسے آواز دی

"یہاں آ۔"

وہ واپس آیا۔ بے حس ہاتھوں، دماغ، دل اور روح کے ساتھ اس نے اس حقیقت کو مان لیا کہ اس کی آدھے دن کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔

کام ختم کر کے وہ گھر پہنچا تو چھ بج چکے تھے۔ اس کے گھر میں جمع مہمان اور عورتیں ڈھولک کے گیتوں اور مذاق اور ہنسی ٹھٹھوں سے تمام شگون قایم رکھنے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ وہ واپس آیا تو دلہن کے گھر جانے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور میلے کپڑوں کو لئے واپس آ گیا۔ اس نے کپڑے بدل ڈالے۔ دق کے مریض کی قمیص اور پتلون نکال کر اس نے پہن لی۔ اس کی رشتہ دار عورتوں نے چند پر شگون رسوم سے تمام بھوتوں چڑیلوں کے سائے دور کر دیئے۔ وہ شادی رچانے کے لئے تیار ہو گیا۔

کیا اس کی بیوی خوش قسمت نہ تھی۔ کیا وہ فیشن پرست بڑے شہر میں رہنے والے امیر، خوبصورت، خوب سیرت، ہمدرد، محب دولہا کی بیوی نہ تھی۔ کیا وہ شہر کے بہترین علاقے میں نہ رہتے تھے۔ ننھی بھنگن اپنی خاموشی، بدبودار کپڑوں میں لپٹی رہنے اور گٹھڑی بن کر بیٹھے رہنے کے باوجود ان رازوں سے واقف تھی۔

اسے ان بڑے گھرانوں میں، خوبصورت عمارتوں میں کام کرنا تھا۔ وہ بغیر دیکھے اس بارے میں کیا رائے قایم کر سکتی تھی۔ اس کے خاوند نے کہا——

"چل، تجھے میں کام سکھا دوں۔"

اسے معلوم نہ تھا، کام کیا ہوگا۔ وہ سیکھنے کے لئے تیار ہو گئی۔ گلی میں داخل ہو کر وہ رک گیا۔ گھونگھٹ میں سے اس نے اپنے خاوند کو دیکھا۔ بڑے فخر کے ساتھ اس نے کہا۔ "یہ ساری گلی میری ہے۔"

اس نے دیکھا۔ لمبی، تنگ، تاریک۔ ...... اس نے دیکھا لمبی، چوڑی صاف شفاف، اینٹوں کے فرش کی گلی ...... ساری گلی اس کے خاوند کی تھی۔ اس کا خاوند کتنا بڑا آدمی تھا۔ وہ اپنے دل کو احساس کو ضمیر کو، روح کو، دماغ کو، وجود کو سنبھال نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس کا خاوند بہت بڑا تھا۔ وہ ساری گلی اس کی تھی۔ گویا وہ تمام عمارتیں، ان میں رہنے والے لوگ، گلی میں کھیلنے والے بچے، اوپر اڑنے والے پرندے اور بلیاں کتے پتھر اینٹیں ــــ ساری کائنات اس کے خاوند کی تھی۔ کیا اسے کبھی یہ سب کچھ معلوم تھا۔ پہلے وہ قیاس بھی نہ کر سکتی تھی۔ پہلے یہ ناممکن تھا۔

اس کے خاوند نے گلی کی اینٹ اینٹ پر اپنی نگاہوں کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "یہی نہیں، اس کے علاوہ اور بھی۔"

وہ اشتیاق سنبھالنے سے قاصر تھی۔ وہ متعجب، خوش، پریشان، پُرمسرت ان عمارتوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ کام کرنا چاہتی تھی ــ اس کے میکے کے لوگ ان باتوں سے کتنے بے بہرہ تھے۔ وہ کتنے نادان تھے۔ کیا اتنی مدت تک وہ خود بیوقوف نہیں رہی تھی۔ وہ تو اب زندہ ہوتی تھی۔ شہر میں آ کر اس گلی کی وسعت کو دیکھ کر خاوند پا کر۔

وہ اسے ایک گھر میں لے گیا۔ دروازہ کھلا تھا ــــ وہ اندر داخل ہوئے صحن میں کوئی نہ تھا۔ وہ جھجکی۔ "چلی آ۔" وہ سمٹی سمٹائی اس کے پیچھے چلتی رہی۔ اس نے صحن یا برآمدے میں نہیں دیکھا۔ اس نے کمروں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے خاوند نے کہا۔ "دیکھ۔"

اس نے دیکھا۔ "یہاں پانی دھرا ہے۔" وہ کام کے متعلق مختلف معلومات مہیا کرتا رہا۔ وہ سنتی رہی۔ پھر یکدم اس نے گھونگھٹ اٹھایا۔ اس نے پاخانے کا جائزہ لیا۔ وہ دیر تک حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس سے عمارتوں کے اندر کا یہ منظر حفظ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے دیواروں کو چھوا۔ دروازہ کھولا اور بند کیا۔ پھر وہ پھرتی سے گھونگھٹ نکال کر کھڑی ہو گئی۔

وہ ہنسا ـــ "اس سے بڑھیا مکان بھی ہیں۔" اس نے اسکی حیرت کو بڑھانے کی کوشش کی۔

"تو دیکھتی رہ۔"

وہ ہر مکان میں گئے ـــ آہستہ آہستہ اس کی جھجک، شرم دور ہوتی گئی۔ وہ ہر نئے مکان کے غلیظ ترین گوشوں میں جا کر یوں دیکھتی جیسے وہ کسی محل کی بہترین بیٹھک ہو۔ اس کے خاوند نے کہا۔ "جو نیا مکان بنا ہے نا۔ وہ بہت اچھا ہے۔" اور وہ اسے نئے مکان میں لے گیا۔

"کون ہے۔؟"

"میں ہوں جی مالکن!" اس نے شرما کر کہا۔

"تو یہ ہے تیری بہو ـــ" مالکن نے کہا۔

"ہاں ـــ" اس نے کہا۔

"آج بھی تو چھٹی منا رہا ہے۔ روز روز چھٹی نہیں ملے گی۔ سمجھا۔"

وہ ان نرم الفاظ کو سن کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

"جی مالکن ـــ"

"کام یہ کرے گی کہ تو ـــ"

"یہی کرے گی۔ میں نے بتا دیا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ اسے کام بتانے کے لئے لے گیا۔ مالکن نیچے سے نئی بھنگن کو کام کے بارے میں ہدایتیں دیتی رہی۔ یکایک اس کے خاوند نے جھنجوڑ کر اسے بے معنی جمود سے نکالا۔ "دیکھ۔" اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے گھونگھٹ کے نیچے سے سامنے کھلے حیرت انگیز کرشمے کو دیکھا۔ "آہا۔" اس نے کہا۔ "یہ اچھا ہے۔"

اس نئے مکان کی ٹائیلوں کی نبی دیواروں اور فرش کے بیت الخلا کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اسکے لئے تیار نہ تھی۔ اب شہر کو اس نے صحیح طور پر دیکھا تھا۔ کیا اس کے تمام رشتہ داروں، بلکہ تمام گاؤں کے رہنے والوں نے ایسے مکان دیکھے تھے۔؟ وہ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی جیسے وہ یکدم اس مٹی کی نبی زمین سے دُور پہنچ گئی ہو۔ اس نے ان دیواروں کو چھوا۔ سونگھا۔ اس چھت پر کی گئی قلعی، فرش کی پختہ رنگین ٹائیلوں اور پانی کے نل کو دیکھا۔

"ہماری گلی میں سب سے بڑھیا مکان ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

اس نے فخرِ ملکیت، اجنبیت سے کھڑکی سے باہر ساری گلی کو ایک بار پھر دیکھا۔ فخر سے اس کی بھویں تن گئیں۔ گردن اکڑ گئی۔ انہوں نے غلاظت اٹھائی۔ گھونگھٹ نکالے وہ سیڑھیوں سے اتر گئی۔

آزاد نُسش

وہ ٹکٹکی باندھے بغور دیکھتا رہا۔

گائے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کی پسلیاں، اس کے کندھے، چرتی ہوئی سلاخوں کی طرح مخاطب کرتے تھے۔ وہ کچھ سونگھ رہی تھی۔ اس کی ٹکٹکی کی شدت بڑھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دبی دبی چمک تھی۔ اسے اپنی ناک پر بیٹھتی، اڑتی اور کھجاتی مکھی کو ہٹانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا محو ہو چکا تھا۔

سونگھتے سونگھتے آخر جاہل گماتے مٹی میں پڑے خاک آلود بڑے گھیئے کے آدھے حصے کو کانپتے اور پھیلتے نتھنوں کے نیچے سفید دانتوں سے چبانے لگی۔ دو لقموں میں اس بڑے ٹکڑے کو ختم کر کے اس نے آنکھیں تیزی سے جھپکیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور زبان سے منہ چاٹ کر جلدی سے ساتھ کی سبزی کی دوکان میں سجی ہوئی ٹوکریوں میں سے یکے بعد دیگرے کھانا شروع کر دیا۔ ٹماٹر، ساگ، آلو، گھیا، ٹینڈے اور بینگن ــــــ شاید اس کے معدے میں گھبراہٹ کم ہو گئی یا اسے جشن

میں کسی مداخلت کا شک نہ رہا تھا اور وہ بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ مسرور آنکھوں سے شانتی بھرے چہرے سے جگالی کی حالت کے نزدیک تر تھی کہ اچانک ایک گولی کی طرح اس کی پیٹھ میں سنسنی ہوئی ٹیس سے وہ چونک پڑی۔

وہ بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اب اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے میں دل چسپی نہ تھی، تسکین نہ تھی نہ ہی طنز کا خیال ہو سکتا تھا۔ محض ایک قہقہہ جس کی وجہ شاید وہ خود بھی بیان نہ کر سکتا ہو۔ محض اس واقعہ کا معمولی اثر تھا۔ گائے کو اپنی حرکت کا احساس ضرور تھا کیونکہ وہ جلد ہی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور بے سر دکاری اور معصومیت کو چہرے پر پیدا کر کے بڑھ جانا مناسب سمجھا۔

ایک لاٹھی رسید کرنے کے علاوہ سبزی والے نے بھی اس واقعے کو اہمیت نہ دی۔ اس کے بے وجہ قہقہے کا جسے وہ طنز یا پھبتی تصور کر لیتا، اس کے چہرے پر کوئی ردِ عمل نہ ہوا۔ جھاڑن سے ٹاٹ صاف کر کے وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آدھے کھائے ہوئے سبزی کے ٹکڑوں کو اس نے ایک ٹوکری میں الگ رکھ دیا۔ اس نے سوچا کہ شاید اسے غریب لوگ خرید لیں گے۔ پکنے کے بعد خوشبو ہو گی اور پھر سالن تو ہو گا۔

بھیڑ بڑھ گئی۔ صبح کے آٹھ بجنے کو تھے۔ وہ تنکا اٹھا کر دانتوں کو بے وجہ کریدنے لگا۔ کیونکہ جب سب لوگ ملازمت میں مصروف ہوں تو بیکار ایک بت کی سیڑھیوں پر بیٹھنا اس کے لاپرواہ ضمیر کو بھی غیر فطری معلوم ہوتا تھا۔ دانت کریدتا آدمی بھی مشغول نظر آتا ہے۔ وہ ہر ایک کو جانتا تھا۔ وہ چھوٹے سے بازار کے چھوٹے سے چوک پر ایک بت کی سیڑھیوں پر بیٹھا بظاہر دیکھ رہا تھا لیکن اس کی بے سر دکاری حد سے زیادہ تھی۔ اسے ان سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اگر روزانہ معمول سے گزرتے ایک شخص کو وہ کسی روز نہ دیکھتا اور کوئی اسے بتا دیتا کہ وہ شخص رات کو مر گیا تو اسے پہلو بدلنے

کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اور وہ کسی نامعلوم چیز پر اپنی تیز آنکھیں گاڑ دیتا اور دلچسپی سے
محو ہو جاتا۔ اگر آپ اسے یہ بھی کہہ دیتے کہ اس شخص کی چھوٹی چھوٹی پانچ لڑکیاں ہیں تین
لڑکے ابھی تعلیم ختم نہیں کر چکے۔ لڑکیوں کی شادیاں تعلیم رزق وغیرہ ــــــ لیکن
وہ ایسی جذباتی باتوں کو سننے کا قائل نہ تھا۔ اس کی خاموشی سے آپ یہ اخذ کر رہے
ہوتے کہ وہ بے سروکاری سے سہی لیکن محسوس کر رہا ہے اور دفعتاً ایک فلک شگاف
قہقہے سے وہ آپ کو چونکا دیتا ــــــ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک طرف اشارہ کر رہا
تھا۔ اس لئے نہیں کہ آپ کو مخاطب کرے، محض یہ اس کی دلچسپی کا اظہار تھا۔ دو
لونڈے ایک کیلے کے لئے ایک دوسرے کے چہروں اور جسموں کو سرخ کر رہے تھے۔
پہلوانوں کی طرح شکست دینے کی ہر ترکیب استعمال کر رہے تھے لیکن کیلا زمین
پر گر چکا تھا اور کوئی بندر چپکے سے نگل کر چلا بھی گیا تھا۔ چنانچہ وہ ہنس رہا تھا۔
اس لئے اس معمولی سے واقعہ پر آپ کو یکدم اس سے نفرت اور طیش سے ملنا آنا چاہئے۔
مگر اسے کوئی احساس نہیں تھا۔ آپ گالیاں دیتے یا مرنے مارنے پر بھی تل جائیں
تو اسے احساس نہیں تھا۔ "ہٹو۔" اس ایک لفظ سے جس کی ادائیگی میں آپکی حیثیت
کو وہ پوری طرح ظاہر کر دیتا تھا۔ آپ کو اچنبھا سا ہو جاتا۔ اور اپنے تخیّل سے آپ کو ہٹا
کر وہ پھر مشغول تھا ۔۔۔۔۔۔ لیکن دراصل وہ بندر کے کیلا کھا لینے پر نہیں
ہنسا تھا۔ اسے ان لڑکوں کے خیالات کی ناپختگی پر افسوس ہوا تھا جو کیلے کو یکسر
بھول چکے تھے۔ اور اب محض لڑائی کر رہے تھے اور کچھ دیر بعد غصّہ سے کپکپاتے
ہوئے وہاں سے جا رہے تھے۔

کبھی کبھی وہ سبزی والے کو کہتا تھا۔ " وہ چیز جسے آدمی چاہنے لگتا
ہے۔ اس کے لئے جان گنوانے کو تیار نہیں ہوتا۔" وہ سبزی والے کو بغور دیکھتا۔
کیونکہ کام کرتے وقت وہ فائدہ نقصان سوچنے لگے تو اس چیز سے نفرت کرنے لگے گا۔

وہ محض کام ہی کرتا ہے جیسے یہ ڈولونڈے لڑتے وقت ایک دوسرے کو مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہیں کھیلے کی لذت یا ضرورت کا احساس نہ تھا ورنہ اسے بانٹ لیتے ہم کسی خاص مقصد کے لئے کام نہیں کرتے۔ کام کرنے لگتے ہیں تو کرتے رہتے ہیں۔"

اس نے بھی کچھ نہیں سوچا۔ اس نے کسی تماشے کا انتظار نہیں کیا لیکن صبح وہ وہیں موجود رہتا تھا۔ رات کو وہ کہاں تھا۔؟ کہاں کھاتا تھا اور بغیر کمائے بغیر کوشش کئے، وہ آخر کیونکر زندہ تھا۔ اس کا جسم بھاری تھا جس کی وجہ اچھی خوراک تھی۔ لیکن وہ بے فکری اور اچھی خوراک کہاں سے ملتی تھی۔

اس بے فکرے کو دھوپ کی تپش بہت محسوس ہونے لگی تو اس نے پہلو بدلا۔ جب تک لوگ پریشان حال ہو کر اپنے اپنے کاروباروں کی خاطر دوڑتے رہے وہ بت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سبزی والے کا دھندلا دھندلا جائزہ جمائی لیتے ہوئے لیا۔

وہ سبزی والا کتنا معصوم دکھائی دیتا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ "جب تک کسی کے اختیار میں کوئی ایسا وصف نہ ہو جس سے وہ اثر انداز ہو سکے وہ معصوم دکھائی دیتا ہے۔" وہ اپنے خیالوں ہی سے خوش ہو گیا۔ سرخ پتھر کی سلیں اب گرم ہو گئی تھیں۔ ہوا بھاری ہو چلی تھی۔ ایسی بو تھی جیسے زمین بھن رہی ہو —— بھنی مٹی کی بو —— وہ سیر کر رہا تھا۔ جب اکتا جاتا تو گھاس کے فرش پر لیٹ جاتا تھا۔ گو اسے چھت کی بھی ضرورت ہو جاتی تھی۔

"چلے" سبزی والے نے چونک کر پوچھا۔

روزمرہ کی طرح یہ الفاظ اس کے روانہ ہونے کا اشارہ بن چکے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں سبزی والا ایک لفافہ تھما دیتا —— وہ اسی خاموشی سے لے لیتا اور چل دیتا۔ لفافے کو اپنے گھر پہنچانے کے لئے سبزی والا اسے ایک دن کی

سبزی دیتا تھا کیونکہ وہ اکثر اسی کے یہاں رہتا تھا۔ اور سبزی والے کو اطمینان تھا کہ وہ ہر معاملے سے الگ تھلگ مست آدمی ہے۔

وہ چل پڑتا۔ اور گھومتے گھومتے، گھر میں دوپہر کے نزدیک پہنچتا۔ دوپہر کا کھانا تو سبزی والا صبح سویرے اپنے ساتھ لے آتا تھا لیکن شام کے لئے سالن وغیرہ اس لفافے کے ملنے کے بعد اس کی بیٹی بنانا شروع کرتی تھی اور وہ دوپہر کے چند پھیکے لمحات وہیں ایک چارپائی پر سو کر گزار دیتا تھا۔ اس روز جب وہ گھر پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی اور وہ تھکا ہوا تھا۔ گرمی کافی تھی لیکن پریشان کن نہیں تھی۔ محض ہلکی سی بیزاری بھاری بوجھل پلکوں کو خمار سے تھپکا دیتی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اور اسے حسب معمول پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے ایک کونے میں لفافہ رکھ دیا اور چارپائی پر گر کر سو گیا۔

جب وہ جاگا تو شام ہو چکی تھی۔ سبزی والے کی بیٹی گا رہی تھی۔ اس نے کبھی اس لڑکی کو گاتے نہیں سنا تھا۔ اپنے باپ یا اس کی موجودگی میں وہ ہمیشہ خاموش اور بے حس دکھائی دیتی تھی۔ اسے قدرے حیرت ہوئی وہ وہیں لیٹا اس لڑکی کی آواز سنتا رہا۔ وہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ خلا میں رہا کرتا تھا۔ اچانک دروازہ پر دستک سن کر لڑکی کا گانا بند ہو گیا۔ انتہائی خاموشی میں وہ لڑکی کی تیز حرکتوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ —— دروازے پر دستک لڑکی کے باپ نے دی تھی لیکن اس نے ابھی تک دروازہ نہیں کھولا تھا —— دروازہ پر پھر دستک ہوئی۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے ناپسندیدگی سے لڑکی کو دیکھنا چاہا۔ اور پھر وہ ٹھٹک گیا۔ وہ نہا رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سبزیوں والا لفافہ وہیں کونے میں پڑا تھا۔ لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ وہ گھر میں موجود ہے اور اسے

دیکھ رہا ہے۔ وہ ششدر رہ گیا۔ ایسی صورت میں وہ کیا کر سکتا تھا۔ اب اگر وہ اپنی موجودگی کو ظاہر کر دیتا تو ؟ اور اس کا وہاں رہنا کتنا نامناسب تھا لیکن باہر جانے کی کوئی راہ نہ تھی۔ دروازے پر دستک پھر ہوئی۔ اسے وہاں ساکت رہنا دشوار ہو گیا۔ اس نے کوئی چارہ سوچنا چاہا ــــــ لڑکی نہائے بغیر اٹھ نہیں سکتی تھی اور اس کا باپ باہر کھڑا پریشان ہو رہا تھا ــــــ ابھی نہا چکنے میں دیر تھی۔ چنانچہ لڑکی نے اکتا کر آواز دی۔

"ابھی کھولتی ہوں۔"

لڑکی کا باپ سمجھ گیا ہوگا کیونکہ دروازہ پر دستک بند ہو گئی تھی۔ اُدھر وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اپنی موجودگی کا ذرا بھی اشارہ کرنا ناممکن سی بات تھی۔ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرح بچیا۔ شاید اس کی زندگی میں سوچنے اور غور کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا اور اسے طیش آ گیا۔ وہ لڑنے مرنے تک تیار ہو گیا۔

پھر لڑکی نے دروازہ کھولا۔ باپ نے شکایت کی اور بیٹی نے عذر بیان کیا۔ جب وہ دونوں واپس آئے تو وہ وہاں تھا۔ ایک لمحہ کے لئے بوڑھا ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی بیٹی کے اوسان جاتے رہے۔ وہ وہاں کب اور کس طرح وارد ہو گیا۔ معاملہ صاف تھا۔ وہ وہاں بیٹھا تھا۔ اور سبزی والے کی لڑکی نہا رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ وہاں کیوں تھا۔ ؟ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "تم یہاں کیسے۔ ؟" پھر اس نے کہا۔ "اس وقت ؟"

اسے خود معلوم نہ تھا۔ وہ خود احمق سا بن گیا۔ جب اس نے کبھی کسی بات کو اہمیت نہ دی تھی تو وہ اب عذر یا وجوہات کیسے سوچ لیتا۔ اس کے نزدیک بات بالکل صاف تھی۔

"تم ابھی تو یہاں نہیں تھے۔" لڑکی کی اس احمقانہ صفائی نے اسے

مجرم بنا دیا۔ باپ کے شکوک پختہ ہو گئے۔ وہ چلایا۔ "یہ کیا ہے۔؟"

اس نے آخر جواب دیا۔ "کچھ نہیں یار۔۔۔" بوڑھے نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اور پھر دوسرے ہاتھ سے جھپٹ کر لڑکی کے بالوں کو دبوچا۔ اور دہتی ہوئی آواز میں گرج کر سوال کیا۔ "یہ کیا ہے۔؟"

وہ پہلے ہی طیش میں تھا چنانچہ اس نے صلح صفائی کی خاطر کہا۔۔۔

"چھوڑ۔۔۔"

سبزی والے کو یقین ہو گیا اور اس نے بڑے غصّہ سے ایک بار اسے گھور کر دیکھا۔ "خیر میں تمہیں تو کیا کہوں۔۔۔" اس نے بھنچے ہوئے دانتوں میں سرگوشی کی اور اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ دروازہ سے باہر لڑھکتے ہوئے سنبھلا اور کھڑا ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنا حیرت انگیز تھا۔ اتنی جلدی ہو گیا تھا ـــــ وہ ابھی تک حیران تھا۔ کوئی پہلو اسے سلجھا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بوڑھے کو چلاتے ہوئے سن رہا تھا جو مٹی کے تیل کے کنستر کو ڈھونڈ رہا تھا اور اپنی لڑکی کو جلا دینا چاہتا تھا۔ وہ غصّے سے پاگل ہو گیا تھا۔

ایک بات اس پر اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اب وہ اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اسے تکلیف ہوئی۔ وہ اس حادثے کو کوسنے لگا۔ اس آشیانے کے چھین جانے کا اسے بہت افسوس ہوا لیکن اسے دوبارہ پانے کی ہمت اور امید نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

وہ کہاں جائے؟ اس کا جواب اسے مل جاتا اگر اس نے کبھی غور کیا ہوتا۔ کبھی یہ سوال معمّہ کی طرح الجھ کر اسے پریشان کرتا لیکن وہ سوچنے کے قابل ہی نہ تھا۔ وہ بار بار سر ہلا رہا تھا۔ کیونکہ جو بات اس نے صحیح سوچی تھی وہی اسے یاد آرہی تھی کہ سبزی والے کو طاقت کا مظاہرہ کرنے اور برتنے کا موقعہ ملا تو اس نے اپنی

سادگی، اپنی مظلومیت کو چھوڑ کر حملہ کر دیا تھا۔

یہ ہے زندگی! یہ عام حقیقت اسے بہت اہم اور عظیم محسوس ہوئی اور وہ چوراہے کے بت کے آگے پیچھے گھومتا رہا۔ اس بازاری منظر کو دیکھ کر وہ اپنے ہر قسم کے رنج کو بھول گیا۔ چنانچہ وہ روزمرہ کی طرح وہاں اپنا وقت رونق اور بھیڑ میں گزار کر خوش ہو رہا۔

رات بڑھ گئی تھی۔ اور سبزی والے کی طرح کئی دوکاندار واپس گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ دیوالی کی طرح جگمگانے والے قمقموں کی روشنی میں بھی فرق آ گیا تھا۔ اکا دکا دوکانیں کھلی تھیں اور وہ انہیں کے نزدیک جا بیٹھتا پھر وہ بھی اٹھ کر واپس چلا آیا۔ "کہاں؟" دفعتاً اس کے پاؤں رک گئے۔ وہ کہاں جائے گا۔ پھر اسے تکلیف ہوئی کہ بے وجہ سبزی والے نے اسے پریشانی میں ڈال دیا۔ لیکن اسے اس گھر میں جا کر سونے کی ایسی عادت تھی کہ ایک امید سی جھلکتی رہی کہ یہ وقتی طیش ختم ہوگا۔ پھر وہ "اپنے" گھر میں واپس جائے گا۔ یہ محض چند روز کی بات تھی۔ اور سوچتا یہ تھا کہ وہ چند روز کیونکر گزریں۔ ؟

اگلی صبح اسی بت کے گرد چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں پر اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا دائیاں ہاتھ چوتھی سیڑھی پر تھا۔ سر دوسری پر اور ایک ٹانگ چھٹی اور آخری سیڑھی پر تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہاتھوں اور پاؤں کی بلندی اور پستی کی وجہ سے نیند بھی اچھی آ گئی تھی اور اعضاء کی تھکاوٹ بھی دور ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری سیڑھی پر بڑے آرام سے پڑا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح صبح کی تازگی کا مزہ لیتا رہا۔ پھر اسے سیڑھی کا چوک میں ہونا محسوس ہوا۔ اسے دور بھنگی کے جھاڑو کی آواز سنائی دی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کتنی خاک اڑ رہی تھی۔ پھر اس نے ذہن میں مکمل تصویر قائم کر لی۔

"وہ سیڑھی پر سویا ہوا تھا۔!!!"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ فوراً اتنی اخلاقی پستی اس میں پیدا کیسے ہو گئی؟ ۔ اس نے سورج کی روشنی میں چندھیائی آنکھوں سے دوکانوں کو دیکھا سبزی والا اپنی جگہ پر موجود اسے نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو اسے فی الحال وہاں سے ہٹ جانا چاہیے ـــــ یہ پہلا نقصان اسے بھگتنا پڑا کہ وہ اب اس کے پاس اس دوکان کے سامنے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

پھر اسے بھوک لگی اس نے سوچا کہ اگر وہ چلتا رہا تو تھکاوٹ بڑھ جانے کی وجہ سے اس کی بھوک میں اضافہ ہو جائے گا۔ ایک جگہ بیٹھنے سے اس کی طاقت کم صرف ہو گی۔ پھر وہ ایک صاف ستھرے گھر کے سامنے بازار کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ رونق کم تھی اور ایک اکیلا، بیکار آدمی وہاں بیٹھا کیا کرتا۔ لیکن وہ اپنے دل اور دماغ پر قابو پا کر وقت گزارنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب دھوپ بت کے سائے کو پانچویں سیڑھی تک کھینچ لاتی تو وہ ہمیشہ گھر کی طرف چلا جاتا۔ وہاں کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد وہ واپس بازار میں آجاتا تھا۔ یہ معمول بہت عرصہ سے اس کی زندگی میں شامل ہو چکا تھا۔ بت کا سایہ پانچویں سیڑھی سے بھی آگے سرکنا شروع ہو گیا۔ لیکن وہ کہاں جائے ۔؟ اس نے سوچا کہ بیٹھنے سے اس کی طاقت برقرار رہے گی۔ اس کے کلیجے میں، اس کے پیٹ میں ایک سنسنی بھر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ دل کی ہر دھڑکن ناقابل برداشت حلقے پیدا کر رہی ہے پھر اسے یاد آیا کہ پچھلی رات بھی اس نے کھانا نہیں کھایا ـــــ کل صبح وہ جاتے ہی چارپائی پر سو گیا تھا۔ آخر سبزی والے کو اتنا غصہ کیوں تھا۔ آخر بات ہی کیا تھی۔ جسے آدمی بھول نہ سکے۔

لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ اس کے یہاں اب نہیں جا سکتا تھا۔ اسے یہ معلوم

کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس نے اپنی لڑکی کو واقعی مٹی کے تیل میں کباب کیا یا نہیں۔ اور اگر اس نے واقعی ایسا کیا ہوتا تو وہ دکان پہ اسے گھورنے کے لئے موجود نہ ہوتا۔ دراصل اسے مٹی کے تیل کا کنستر ملا ہی نہ ہوگا۔ تیل ختم ہو چکا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گئی ہوگی۔

بھوک بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اسے بے حد پریشانی ہونے لگی۔ پھر اسے اپنی بے بسی کا اندازہ ہوا۔ دو روٹیاں کہیں نہ کہیں سے مل سکتی تھیں۔ اگر وہ سامنے تنور پہ جاتا تو وہ تنور والا تھوڑے سے آٹے کے لئے بڑی رقم لیتا تھا لیکن گھر میں۔۔۔! کسی باورچی خانے میں اگر دو روٹیاں زیادہ بن جائیں جو وہ لوگ نہ کھا سکیں تو پھر؟ وہ کیا کریں گے۔ وہ گائے کو دے دیں گے یا پھینک دیں گے۔ یا رات کے لئے رکھ چھوڑیں گے۔ ان کے لئے دو روٹیاں کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ اور لوگ کتنے ظالم ہیں کہ کوئی شخص اسے دو روٹیاں بھی نہ دیگا۔ دو روٹیاں کس کو کھٹکتی ہیں۔ دو روٹیاں بھی کوئی چیز ہیں۔ اگر گھر میں ایک فرد بڑھ جائے تو اس کے لئے دو روٹیاں نہ بنیں گی۔۔؟ کتنی حیرت کی بات تھی کہ کوئی اسے اپنے گھر کا فرد نہیں سمجھتا تھا۔ کیا حرج ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ایمان دار معصوم آدمی تھا۔

اونگھتے اونگھتے وہ سو گیا۔ دوپہر کی اداس خاموشی کے بعد شام کی گھما گھمی۔ اسے اُ دوسری صبح کی طرح نمودار ہوتی دکھائی دی۔ جب وہ اٹھا تو اس کی بے چینی بہت حد تک ختم ہو چکی تھی۔ وہ یونہی خوش تھا ــــــــ بھوک اور تھکان کو رفع کرنے کے لئے ایک جگہ بیٹھ جانا قطعی بے بنیاد سا تھا۔ وہ شہر بھر میں لوگوں کو گھورتا، جی بہلاتا رہا۔ حتیٰ کہ رات ہو گئی۔ لیکن آج وہ سڑک پر سونا نہیں چاہتا تھا ــــــــ جب بازار بالکل بند ہو گیا، تو اسے ایک دکان کے سامنے چبوترے پر نیند آگئی۔

اگلی صبح جب وہ اٹھا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ پریشان تھا، غمگین تھا، سہما ہوا تھا اور بالکل ہار چکا تھا۔ کیونکہ اس کی بھوک مطالبے کی منزلوں سے گزر کر اب اسے اذیت دے رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ پھر بھی وہ وہیں بیٹھا رہا۔

اس کا ذہن خلا میں کھو گیا۔ وہ ایک سرور محسوس کرنے لگا۔ اسے اب اپنی خواہشوں اور ارادوں پر عمل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اٹھ بیٹھنے کی ضرورت نہ تھی۔ انگلی ہلانے کی چاہت نہ تھی۔ پلک جھپکنے کا فائدہ نہ تھا وہ آرام سے سوچ رہا تھا۔ ایسی باتیں جن کی کوئی ٹھوس حقیقت نہ تھی۔ جو موجود نہ تھیں۔

پھر یک بیک وہ اٹھا اور یونہی گھومتا گھماتا کسی ایسے آدمی کی تلاش میں نکلا جس کی صورت میں ہمدردی، کم از کم شفقت آمیز مسکراہٹ کا امکان ہو۔ اس نے بیسیوں کو بلایا۔ سینکڑوں کو جانچا۔ ہر واقف آدمی کو مخاطب کیا۔ لیکن وہ لاپرواہی سے بڑھتے چلے گئے۔ لوگ اس کی بے وقت پھبتیوں سے خوف کھاتے تھے۔ وہ ایک دہشت پذیر سایہ تھا۔ جس سے لوگ بھاگتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ جا کر رک گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے کانوں میں بار بار سنسنی کا احساس کیا۔ بڑی مشکل سے وہ بار بار آنکھوں میں آتی ہوئی سیاہی ٹال رہا تھا۔ اس نے سر کھجا کر سوچا۔ کیا کرنا چاہیئے۔؟

پاس کے مکان کا دروازہ کھلا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اس نے نووارد کو بلایا۔

"کہاں جا رہے ہو۔"

باہر آتا ہوا آدمی ٹھٹک گیا ——— "کہیں نہیں ———" وہ جانا چاہتا تھا۔

"بہت جلدی میں ہو ———" وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔

"بھئی، کام کاج کی سو باتیں ہیں۔ کام کرنے والوں کو فرصت کہاں ہوتی ہے۔ کہ جلدی نہ کریں۔"

ایسی بری حالت کے باوجود وہ ہنس پڑا۔ اس آدمی نے تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اور نہیں تو کھانا کون دے۔"

کھانا! اس نے ایک بار سیاہی کو آنکھوں سے ہٹا دیا۔ "کھانا کھا چکے ہو۔؟"
"نہیں ___" وہ آدمی اکتا سا گیا۔
وہ آخر ڈھیٹ ہو گیا۔ "میں آجاؤں۔" اس کا قہقہہ اب ایسے موقعہ پر بے فائدہ تھا۔

"کیوں ___؟" چونک کر وہ شخص دروازے کے اندر کود گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ "لڑکی تو اچھی تھی۔ خاموش لگتی تھی۔ ہم سب کی بہن بیٹیاں ہیں۔"
باہر جانے کی بجائے وہ شخص واپس اندر چلا گیا۔

لوگ اسے اوباش سمجھتے تھے۔ لوگ اسے ملنے جلنے سے خوف کھاتے تھے۔
خیالوں کی رو میں وہ بہتا چلا گیا۔ گلی کے موڑ پر جہاں پھر وہی ٹبا بازار اور بت والا چوراہا تھا، کئی لوگوں نے ایک ہی بات کہی اور سب نے آخر اس کے سامنے بڑے زور سے دروازے بند کر دیئے۔

آخر وہ تھک کر چور ہو گیا۔ اس میں چلنے کی سکت نہ رہی۔ وہ بڑی مشکل سے حواس قائم کئے ہوئے تھا۔ ایک دیوار کا سہارا لے کر وہ اونگھنے لگا۔ اور سوچتا رہا کہ اب کیا کرے۔!

چونکتے ہی وہ تیزی سے اٹھا لیکن اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
بمشکل وہ کھڑا ہو سکا۔ تارے نکل آئے تھے۔ آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر وہ کئی گلیوں میں سے ہوتا ہوا اپنے بہنوئی کے گھر کے سامنے جا رکا۔ اس کی بہن مر چکی تھی۔ اور اس نے کبھی بہنوئی کو اچھی طرح دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ بہن کی شادی پر موجود بھی نہ تھا۔ وہ کبھی اس کے یہاں نہیں گیا تھا۔ لیکن اسے ضرورت تھی اس لئے ساری جھجک ختم ہو گئی۔

اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس کا بہنوئی اسے جانتا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں جا رہا تھا، کھانا کھانے لیکن آپ کو دیکھ کر چلا آیا۔"

یہ بھی تعجب کی بات تھی کہ اس کا بہنوئی ایسا کائیاں تھا۔ "کھانا کھانے کہاں جا رہے تھے۔؟" وہ چپ رہا۔

"بیکار دماغ، بیہودہ باتیں سوچتے ہو۔ کوئی تم نے نئی بات نہیں کی کہ سبزی والا چلاتا پھرتا ہے۔" اور پھر اس کے بہنوئی نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ "تمہاری خاطر کہتا ہوں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ کل صبح دوکان پر آجانا۔ سارا دن لوہا کوٹتا ہوں تو دو روپے کا راشن ملتا ہے ـــــ" اس کی ایک بیوی تین بچے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی زندگی کے ایک پورے دن کی وقعت دو روپے ہوگی۔ ان دو روپیوں سے کیا بنے گا۔؟ انہی دو روٹیاں وہ کسی نانبائی کے تنور سے دو روپیوں میں خریدے گا۔ دو روٹیاں جو لوگ اس لئے کھالیتے ہیں کہ بے ضرورت پک گئی ہیں۔ ضائع نہ ہوں ـــــ اور وہ جسے دو روٹیوں کی درحقیقت ضرورت ہے وہ سارا دن برباد کرکے کھانا کھائے۔!

وہ کتنا عقلمند تھا۔ کتنی دور اندیشی سے کام لیتا تھا۔ وہ ہمیشہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی کس قماش کا آدمی ہے۔ اسی لئے وہ اسے کبھی نہ ملتا تھا۔ لیکن اب چلنے کی بھی بالکل طاقت نہ تھی۔ اب تو ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ سوکھے حلق میں درد حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہی کا غبار مکمل ہو گیا تھا۔ وہ گہری نیند میں بے ہوش ہو گیا۔

جب وہ پھر بیدار ہوا تو دن اچھی طرح نہیں نکلا تھا۔ ابھی چند ایک تارے موجود تھے۔ چاند کی روشنی کافی تھی پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اٹھنے بیٹھنے میں زیادہ پریشانی ہوگی۔

اس کا ذہن پراگندہ خیالوں میں الجھ گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے کئی

واقعات کو از سرِ نو سوچا ــــــ پھر اس کے پیٹ کا درد اس کی برداشت سے باہر ہو گیا - ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ وہ دیوار کا سہارا لے کر چل پڑا -

اس کے سامنے اس کے بہنوئی کی دوکان آگئی ــــــ اس کے یہ شاید بہت دیر ہوئی - وہ گُھستا آیا تھا -

"ہاں ـــ" بہنوئی نے کہا - "کھانا کھانا آسان نہیں - ٹھیک ہے -" اور اس نے اسے ڈھاکوٹنے کا طریقہ سمجھا دیا -

یہ دوکان تھی - سبزی والے کی دوکان سے بہتر اور بہت بڑی - اب اس کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑا تھا - اور دوسرے ہاتھ میں اوزار تھے - سامنے لوہے کی چادر بچھی تھی - اور اسے ہتھوڑے کو اس چادر پہ مارنا تھا -

اس نے ہتھوڑا آہنی چادر پر رکھ دیا - اسے اٹھایا اور پھر رکھ دیا ـــ" زور سے ــــــ" زور ــــ شام کو دو روپیوں کے واسطے زور سے ایک ہتھوڑے کو آہنی چادر پہ مارنا چاہیے تھا لیکن زور ــــــ اس کے ہاتھوں میں سے ہتھوڑا گر گیا - غنودگی کے عالم میں اس نے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی - ہتھوڑے اور ہاتھ کے درمیان ایک فٹ کے فاصلے کو ختم کرنا ناممکن ہو گیا تھا - وہ اونگھنے لگا -

اس نے حواس کو سکیڑا - اس کی آنکھیں کھل گئیں - اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا - اسے کوئی بلا رہا تھا - اس کا بہنوئی ــــــ بلا رہا تھا -

"یہ لے ـــ آدھی روٹی ــــــ" اسے اپنی کھلی ہتھیلیوں اور بے جان سی انگلیوں میں ایک موٹی سی آدھی روٹی کا ٹکڑا محسوس ہوا - بڑی کوشش سے اس کی انگلیوں میں حرکت آئی - اس کے بازو نے جنبش کی - اس نے روٹی کا ایک لقمہ توڑنا چاہا -

"جلدی کر ـــــ دائیں ہاتھ میں ہتھوڑا سنبھال کر ـــــ" ایک آواز آئی۔

اس کے دائیں ہاتھ میں روٹی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا ـــــ اس کے نیم جان ہاتھ روٹی کا محض احساس کر سکتے تھے۔ اس نے بڑی مشکل اور بڑے طیش سے ایک لقمہ توڑا۔ اس کے تیز دانت انتقام سے چبانے لگے ـــــ اس کے رقت آمیز گلے سے ایک سسکی نکلی اور پھر اس کی خشک آنکھوں میں آنسو کانپنے لگے۔

ـــــ اور ان آنسوؤں کے دھندلکے میں سے اس نے روٹی کو دیکھا۔ اور نیچے ایک فٹ کے فاصلے پر پڑی آہنی چادر پہ اس کے ایک آنسو کے ٹپکنے کی آواز ہوئی ـــــ اور طیش سے بھری بے روک سسکیوں کے درمیان وہ لقمے نگلتا گیا۔!

ـــــــــــ

ہمیشہ کیلئے

نظارہ خوبصورت تھا۔

تھوڑے فاصلے پر پہاڑوں کی چٹانیں تھیں۔ اردگرد برباد، روندی ہوئی جھاڑیاں اور چند ایک سہمے مرجھائے درخت تھے ٹینکوں اور مشین گنوں نے قدرت کی اس معصوم تخلیق کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ چند ایک پرندے، بدحواس، سنبھل سنبھل کر اڑ رہے تھے۔ آسمان میں کہیں بھی چیلوں یا پرندوں کے نقطے نظر نہیں آتے تھے۔ جو تھے وہ درخت کی ٹنڈی شاخوں میں چھپ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ درخت ان کے گھر تھے۔ جہاں سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ غریب رات بھر آرام سے سوتے تھے۔ یہاں ان کے خاندان عرصہ دراز سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن انسان کے گھروں کے ساتھ ساتھ ان کی شاخیں پتّیاں اور درخت بھی تباہ ہو گئے تھے۔ معصوم آدمیوں کی طرح وہ بھی ابھی تک ان خوفناک ٹینکوں اور بموں سے سہمے ہوئے سہمے رہے تھے۔——

تاہم نظارہ خوبصورت تھا۔ اس لئے کہ اب خاموشی تھی۔ فاتح فوجیں آگے بہت دور پہنچ چکی تھیں اور یہ جگہ اب محفوظ تھی اس لئے کہ نزدیک ہی پہاڑ تھے۔ بادلوں کی سیمیں لہریں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ اگر آدمی ان چند تکالیف کا اندازہ نہ کرے تو ویران جھاڑیاں یا درخت بھی خوبصورتی میں شامل ہو سکتے تھے۔ پرندے بھی درختوں میں گھوم پھر رہے تھے اور ہوا ہمیشہ کی طرح خوشگوار تھی ــــــــــــ

اس کے باوجود اس کا کام ان حسین نظاروں میں کھو جانے کا نہیں تھا۔ وہ جنگل میں گھومنے اور کسی بھی غیر آدمی کو ڈھونڈ نکالنے پر تعینات تھا اور وہ جانتا تھا کہ کافی عرصہ اس جگہ کو دیکھنے بھالنے کے بعد کسی غیر کا ہونا ناممکن بات تھی۔ لیکن وہ دن شک کے تھے اور اس کے دل میں بھی شبہ تھا۔ کیا معلوم کوئی نزدیک ہی چھپا ہو۔ چنانچہ اس نے بندوق ہوشیاری سے تھام لی۔ اس کے باوجود وہ اپنے ذہنی سیلاب کو روک نہ سکا۔ اس کا دل، دماغ بلکہ وجود ہی کہیں اور کھو جانا چاہ رہا تھا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اس حسین نظارے کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا شک اسے بار بار پریشان کر دیتا جس طرح اس کے قدموں کی چاپ پرندوں کو چیخنے اور خوف زدہ ہونے پر آمادہ کر دیتی۔

یکدم اس سے تقریباً دس پندرہ گز کے فاصلے پر آہٹ ہوئی۔

وہ سنبھل گیا۔ بندوق تان کر اس نے آواز دی۔

"کون ہے۔"

"کون ہے ــ" جیسے پہاڑوں نے اسے آواز دی ہو۔ لیکن وہ آواز مقابلہ کر رہی تھی۔ اس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس بڑی جھاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ جھاڑی کے دوسری طرف ایک

آدمی تھا جس کے چہرے پر وحشت تھی۔ اس کے گندے چیتھڑوں اور اس پر سوکھے لہو کے دھبوں نے اور بھی بھیانک بنا دیا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔ "کون ہے وہیں رہو ــ"

وہ آدمی وہیں کھڑا رہا۔ لیکن اس نے اپنے ہاتھ میں ایک پتھر پکڑ رکھا تھا۔ بندوق کی نالی اپنے سینے کے نزدیک دیکھ کر اس نے پتھر پھینک دیا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کے وحشی اور خوفناک چہرے پر پسینہ آگیا۔ وہ زمین پر دوزانو گر پڑا۔

اس نے بندوق اس کے سامنے کر دی۔ اس کے نزدیک پہنچ کر اس نے اسے جانچنے کی کوشش کی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ آدمی دشمن تھا۔ پکڑے جانے پر اسے اپنے مستقبل کا علم ہو چکا تھا۔ اور اس کے خیالات بندوق کی نالی میں تھے۔ جہاں ایک ہلکی سی جنبش سے اس کی موت آسکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ اس کے ماتھے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ تقریباً سسکیاں لے رہا تھا۔

اس کا اپنا دل درد سے بھر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ موت کتنی بھیانک اور ناپسندیدہ چیز ہے۔ اتنے مورچوں پر لڑنے کے بعد وہ ان روتے اور سسکتے آدمیوں کے کرب کا اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا۔ اس طرح میدانوں یا پہاڑوں میں مرجانا ایک حماقت تھی اور اتنی خوبصورت مسکراتی زندگی کی خاطر وہ بھی پسیج گیا۔ اس کے علاوہ وہ اسے مارنے کو تیار نہ تھا کیونکہ اس آدمی سے کئی باتیں دریافت ہو سکتی تھیں۔ اس کا کام ایسے قیدیوں کو افسر کے حوالے کر دینا تھا ــــ

اسے سب کچھ یاد تھا۔ اپنا بچپن، اپنی ماں کا پیار، اس کی ممتا بھری

جھڑکیاں اور گھر کا ملائم بچھونا۔ خوبصورت مکان، اچھا کھانا اور کھیلنا اسے یاد تھا۔ آدمی اتنا پڑھ لکھ کر تجربہ کار ہو کر اور بیسیوں کام کرنے کے بعد جب مر جاتا ہے تو اس کی وہ ساری داستان کتنی فضول اور بے فائدہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس لمحہ اور اس جگہ گولی کھا کر مرنا اسے بھی پسند نہ تھا۔ وہ خود اس سے پہلی رات لذیذ کھانے کے ساتھ شراب پی رہا تھا۔ اس وقت موسیقی کی دھنیں اسے بیحد خوبصورت لگی تھیں۔ کتنی دیر تک وہ اس سحر میں کھویا رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا تھا۔ پھر وہ لوگ کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے ——— اور ہو سکتا ہے سامنے بیٹھا ہوا وہ بدقسمت انسان اسی طرح لطف حاصل کر سکا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ بھی چند روز پہلے اپنے ساتھیوں میں اسکی طرح لطیفے سُن سُن کر خوش ہو رہا ہو لیکن اب ان سب باتوں کا کیا فائدہ تھا۔ اگر اس کی بندوق کی ایک گولی اس کے سینے میں سے گزر جائے پھر وہ اس افسانے سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ اس نے اس سے سوال کیا۔

"تم کون ہو ——"

یہ سوال اس نے کتنی بار دھرایا۔ قیدی کے گلے میں قت نے بولنے نہیں دیا۔ اس نے بندوق تان لی۔

"تم کون ہو ——"

"میں ——— سپاہی ہوں۔" وہ بولا۔

"میں خود سپاہی ہوں۔" وہ خوش ہو گیا۔ اس وقت وہ مزے میں تھا۔ "تم کس فوج کے آدمی ہو۔"

آدمی نے اپنا سارا حال بتا دیا۔ اس کی ہمّت قدرے بندھ گئی تھی۔ اس نے معصومیت سے کہا۔ "میں ہر طرح خدمت کروں گا۔ ہر قسم کی مشقت

کر دوں گا ۔ مجھے مارو نہیں ۔ "

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "نہیں دوست ۔ ہم تمہاری طرح نہیں ہیں ۔ ہمارے یہاں کوئی ظلم نہیں کرتا ۔ ہم تو انصاف کی خاطر لڑ رہے ہیں ۔۔۔ "

قیدی نے ہمت سے کہا "ہمارے یہاں بھی کوئی ظلم نہیں کرتا ۔ ہم بھی انصاف کے لئے لڑنے بھیجے گئے تھے ۔ ہمیں یہی کہا گیا تھا ۔"

وہ مسکرایا ۔ "ہاں ۔۔۔ کہنے کو تو ہر کوئی یہی کہتا ہے ۔ تم جانتے ہو ہماری قوم ہمیشہ انصاف پسند ، امن پسند رہی ہے ۔ میں خود ایک سپاہی ہوں لیکن اس خونی جنگ سے پہلے میں ایک کسان تھا ۔۔۔۔۔ "

"میں بھی کسان تھا ۔"

"میرے پاس بہت نہیں لیکن تھوڑا بہت بن جاتا تھا ۔ میں خوش حال تھا ۔ "

"میں بھی خوشحال تھا ۔ "

"میری ماں زندہ ہے ۔ "

"میری ماں زندہ ہے ۔ "

"میرا باپ جنگ سے پہلے مر گیا تھا

"میرا باپ جنگ سے پہلے مر گیا تھا ۔ اب میں ماں کا تنہا سہارا ہوں ۔ "

"سچ ۔۔۔ میری طرح ۔۔۔ "

پاس کی ایک چٹان پر وہ بیٹھ گیا ۔ اس کا قیدی اس کی طرح تھا ۔ ہو بہو اس کے سارے حالات خود اس سے کتنے ملتے جلتے تھے ۔ اسے دلچسپی پیدا ہو گئی ۔

وہ احکام سے تھوڑی دیر کے لئے لاپرواہ ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ "زندگی بڑی عجیب ہے۔ کون جانتا تھا کہ میں اپنا ملک چھوڑ کر یہاں اس طرح بیٹھا ہونگا۔ میرے گھر کے ارد گرد ——— میں نے چند پھولوں کے پودے لگائے تھے ———"

"مجھے بھی باغ کا شوق ہے۔ میں اپنے پھولوں کو خود پانی دیتا تھا۔ صبح سویرے۔" قیدی نے کہا۔

وہ حیران رہ گیا۔ کہیں اس کی روح خود اس سے باتیں تو نہیں کر رہی تھی۔ ان دونوں کے خیالات بالکل ایک سے تھے۔ اس نے اپنی جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ——— "لو ———"

کچھ جھجک کے بعد اس نے سگریٹ لے لیا۔

ان دونوں کے خیالات بالکل ایک سے تھے۔ ان کی عادتیں کتنی ملتی تھیں۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا۔ چٹان پر بیٹھ کر اس نے ان حسین زمانوں کو یاد کرنا چاہا۔ ان کا گاؤں علاقے میں بہترین تھا۔ ان کے لوگ تقریباً سب ہی پڑھے لکھے تھے۔ وہ آپس میں مسکرا کر بولتے تھے۔ ان میں کبھی جھگڑے یا فساد نہیں ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "اپنے گاؤں کے مزے تو شہروں میں کبھی نہیں مل سکتے۔ جانے، لوگ شہریوں کو اتنا بلند کیوں سمجھتے ہیں۔ ہمارے دل بہت بلند ہوتے ہیں۔ ہمارے سینے میں محبت ہے۔"

"ہمارے سینے میں محبت ہے ——" اس کا قیدی بولا۔ "ہم دنیا پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں لوگ کبھی نہیں جھگڑتے وہ ایک دوسرے سے محبت سے ملتے ہیں۔"

وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ان دونوں کے الفاظ بھی ایک سے تھے۔ "تمہارا گاؤں کہاں ہے۔"

اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ وہ اپنے گاؤں کی تعریفیں کرنے لگا کبھی کبھی وہ گھبرا جاتا پھر سپاہی کی مسکراہٹ اسے سہارا دے دیتی۔

سپاہی خود گاؤں کی خوشگوار خوشبو میں کھو گیا۔ اپنی زندگی کا ایک ایک واقعہ اسے یاد آنے لگا۔ اس نے کہا۔

"جب میں بھرتی ہوا تو میری شادی ہونے والی تھی۔ میری منگیتر بڑی خوبصورت ہے۔ ہم دونوں میں محبت ہے۔ وہ ہر روز صبح میرے گھر میں آ کر اپنے باغیچے کا ایک پھول میرے کالر میں لگایا کرتی۔ میں نے وہ سب پھول جمع کر لئے تھے۔ میں اسے وہ پھول شادی کے روز دکھانا چاہتا تھا۔ وہ میری سب سے بڑی جائداد تھے۔ مجھے اپنی منگیتر سے محبت ہے ——— میری ماں جلد شادی کرنے کے سلسلہ میں کوشش کر رہی تھی لیکن یہ کمبخت جنگ آ پڑی۔ میری لڑکی اب مجھ سے کوسوں دور ہے۔ جانے ہم کب واپس جائیں۔ وہ سٹیشن پر مجھے چھوڑنے آئی تھی۔ مجھ سے دور کھڑی مجھے دیکھتی رہی اس سے پہلے ہم باغ میں ملے تھے۔ وہ بہت روئی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ عورت کتنی معصوم چیز ہے۔ محض ایک محبت کے لفظ سے اس کے دل کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ایک بوسہ اسے خاموش کر دیتا ہے۔ میری منگیتر کی چٹھیاں ——— لیکن تم لوگ وحشی ہو۔ تم زندگیوں سے کھیلتے ہو۔ ہم دونوں کے بچھڑنے کی ذمہ داری تمہارے سر ہے۔" وہ جوش سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا قیدی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ اس نے اپنی بندوق پھر سنبھال لی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ "نہیں، میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ ہم دونوں کسان ہیں۔ ہماری زندگیاں بھی ایک سی ہیں۔ ہماری مائیں گھروں میں ہمارے لئے ہر روز دعائیں مانگتی ہیں۔ بے چاری ماؤں کا تنہا سہارا دعا ہی ہے۔" اس نے اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ وہ بیحد متاثر ہوا۔ اس نے اپنی بندوق چٹان پر رکھ دی۔ وہ اس کے نزدیک آ گیا۔ اس نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"ہاں، ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم دونوں کا کوئی قصور نہیں قصور تو کسی کا نہیں پھر بھلا ہم کیوں لڑ رہے ہیں" اس نے پوچھا۔ پھر وہ خود حیران رہ گیا۔ واقعی وہ کیوں لڑ رہے تھے۔ خود اپنے گھر میں خوش حال تھا۔ وہ دودھ پیتا تھا۔ مکھن کھاتا تھا۔ گوشت کھاتا تھا۔ اس کی ماں کھانا بناتی تھی۔ بچوں کی طرح وہ اس سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کی ماں اسے پیار کرتی تھی۔ وہ ایک بار ماں سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا۔ اس کا دل بھر گیا۔ وہ اس خاکی وردی اور بندوق کو پھینک کر گانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی، اس کے بچے، اس کے بزرگ سب مسکرائیں اور وہ سب مسکرا رہے تھے۔ پھر جنگ کی کیا ضرورت تھی۔ پھر ان کی زندگیوں سے کیوں کھیلا جا رہا تھا۔ پھر ان کی آزادی خطرے میں کیوں تھی۔ پھر انہیں مرنے کی ہی کیا ضرورت تھی۔ وہ کیوں گھر بار چھوڑ کر آ رہے تھے۔ وہ وہیں بیٹھا سب کچھ سوچ رہا تھا۔

ان دونوں کے خیالات ایک سے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں کی سگریٹیں ایک سی جل رہی تھیں۔ اس نے پھر ایک کش مزے سے لینا چاہا۔ سامنے بیٹھا نوجوان اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تمہاری بھی منگیتر تھی ——؟"

اس نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ہاں —— ہماری شادی ہونے والی تھی۔ میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جنگ نے بلا لیا۔"

"جنگ ——" اس نے چڑ کر کہا۔ "جنگ کی کیا ضرورت ہے۔ تو تمہیں بھی جنگ نے روک دیا۔ تمہاری خوشیوں کو۔ —" وہ آرام سے گھاس پر لیٹ گیا گھاس مرجھائی ہوئی تھی۔ چند روز پہلے یہاں سے ٹینک گزر چکے تھے۔ اس نے قیدی کو دیکھا۔ اب اس کا چہرہ اتنا بھیانک نہیں تھا۔

وہ نوجوان سوچنے لگا۔ اس کا بھی پیارا گھر تھا۔ اس کی ماں بھی کتنی سیدھی سادی عورت تھی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کے گھر کے اردگرد ایک باغیچہ

تھا۔ وہ صبح شام وہاں دل بہلایا کرتا تھا۔ اس کی منگیتر دُور دُور سے اسے دیکھتی تھی۔ ان دونوں کے دلوں میں نزدیک آنے کی چاہت تھی لیکن وقت ابھی دور تھا۔ وہ وقت کے انتظار میں تھے لیکن جنگ ــــــ

وہ خود نہیں جانتا تھا کہ ان کی حسین زندگیوں میں خوف یا خطرہ کیونکر آسکتا تھا۔ جنگ کی کیا ضرورت تھی۔؟ اسے خود نہیں معلوم تھا۔ وہ لوگ خوش حال تھے۔ انہیں بہت سی سہولتیں میسر تھیں۔ پھر یہ جنگ کس نے کی تھی۔ وہ اس جنگل میں کیوں بھیجا تھا۔ وہ اس جگہ چھپنے اور موت کے انتظار میں ڈرنے اور کانپنے کیوں آیا تھا۔ کیا اس لئے کہ اس کے سامنے بیٹھے کسان نے اس پہ حملہ کر دیا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے سپاہی نے گولیاں چلائی تھیں۔ انہوں نے ان کا ملک تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اور اب ــــــ

اس کے سامنے لیٹا ہوا سپاہی یہی سوچ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ ان کی تباہی اور دشمنی پھیلانے والے معمولی کسان نہیں تھے۔ نہ ہی مزدور تھے۔ کچھ اور لوگ تھے جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ سگریٹ ہاتھ میں پکڑے وہاں لیٹ رہا۔ اس کی آنکھیں سگریٹ کے دھوئیں کو فضا میں حل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے کان دردنی آواز سن رہے تھے۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اسے ماں سے ملنے کا ارمان تھا۔ وہ بیچاری اب اکیلی تھی۔ رات دن اس کی بوڑھی ہڈیاں گھر کا کام کاج سنبھال رہی تھیں۔ وہ اس کے لئے شہد جمع کر رہی تھی۔ اس کی ایک ایک چیز کو سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ وہ اسے ملنا چاہتا تھا۔ جلد از جلد ــــــ اس نے اپنے قیدی کو دیکھا۔ اس کے قیدی کی آنکھیں دُور خلا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اس کا سگریٹ گھاس میں بجھ چکا تھا۔ اس نے اسے بلانا نہیں چاہا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا ہو ــــــ اور قیدی واقعی دنیا سے بے نیاز خلا میں گھورتا رہا۔ اسے اپنی

منگیتر یاد آرہی تھی ۔ اپنا گھر، اپنے دوست یاد آرہے تھے اور اس کے دل میں ایک ہی سوال تھا کہ ان کی خوشیوں کو تباہ کرنے والا کون ہے ۔؟ اپنے ملک کی خاطر مرمٹنا اسے پسند تھا ۔ لیکن اس کے دل میں جلن تھی، خلش تھی ۔ اس کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے تھے ۔ اس کی بائیں ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی ۔ وہ کتنے دن اسی جنگل میں چھپتا رہا تھا ۔ آج وہ پکڑا گیا تھا ۔ اس کا کیا بنے گا ۔ وہ اپنے مستقبل سے واقف تھا ۔ دفعتاً جھپٹ کر اس نے بندوق اٹھالی اور سپاہی پر بندوق داغ دی ۔ نوجوان سپاہی تڑپنے لگا ۔

اس نے زوردار قہقہہ بلند کیا ۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا ۔ وہ اپنی وقتی آزادی پر خوش تھا ۔ اس نے بندوق پھینک دی ۔ مرتے آدمی کا چہرہ رو رہا تھا ۔ اس کی گہری سسکیاں درد اور تکلیف میں بسی ہوئی تھیں ۔ اس نے ایک بار کہا ۔ "ماں ۔" پھر وہ بے حس ہو گیا ۔ اور اس کی ہنسی دب گئی ۔ اس کی آواز دب گئی ۔ اس کے کان سن ہو گئے ۔

مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد سسکیاں ہونی چاہئیں ۔ سسکیاں، تکلیف سے اور پچھتاوے ہیں ــــــ ......

التحقیق

یرقان زدہ ناخنوں پر گلابی چھلکنے لگی تھی جیسے خون بھری سرنج کی سوئی سبز رگ میں داخل ہو چکی ہو ۔ پرانے سیاہ بٹوے کو جیب میں رکھتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "ہم کبھی اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کرتے ۔"

وہ خاموش رہی۔ یا تو اس لیے کہ اسے یہ بات جچی نہیں یا پھر وہ سوچنے لگی ہو۔

جب وہ سب مکان سے باہر آ گئے تو اس نے دروازے میں لٹکتے قفل میں چابی گھما دی۔ ایک جنبش نے ساری فضا بدل ڈالی یہ اس بات کی علامت تھی کہ گھر میں کوئی نہیں ——— یکدم ایک عجیب سکوت چھا گیا۔ اطمینان سے اس نے ایک نگاہ ڈالی ۔ آہستہ آہستہ وہ سب پٹڑی پر چلنے لگے ۔ کچلے، سوکھے تنکوں یا پتیوں کا خیال کسی نے نہ کیا۔ بچے بےخبر کبھی آگے کبھی پیچھے رہ جاتے اور پھر ماں باپ کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے خیالات میں محو

ہو جاتے ـــــــ

اپنے اپنے خیالات سب ہی کو بڑے پختہ اور صحیح محسوس ہوتے ہیں اور اس حد تک دوسرے پہلوؤں میں تاریکی قدرتی معلوم ہوتی ہے جب تک سوئے ہوئے اعضا پر چوٹ نہ پڑے۔

اس نے بیوی کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی کو دور کرنے کے لئے سمجھانا چاہا۔ "ہم کبھی لنگر یہ ادا کرہی نہیں سکتے ہم میں اتنا بل ہی نہیں ورنہ جو کا تو کوئی بھی نہیں مرتا۔"

"کتنے ہی مر جاتے ہیں۔" بڑی بے رخی سے اس کی بیوی نے ایک فقرہ دے مارا۔

اس کے جواب میں اس کے پاس کتنی دلیلیں موجود تھیں، کتنے نقطے اس کے سامنے ناچ رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ بھلا اتنی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو آخر ہوا ہی کرتی ہے۔ ورنہ اتنا ظلم تھوڑے ہی ہو سکتا ہے۔ کتنی بار بحث اس سلسلہ میں ہو چکی ہے۔ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس نے اتنی عام سی بات پر اظہار خیال کرنا نامناسب سمجھ کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہو تو سکتا ہے ـــــ" اس کی بیوی نے آہستہ سے کہا۔ "ہوتا ہے، عملی طور پر سب کے سامنے ہوتا ہے۔"

"گناہوں کا ارتکاب ـــــ" اس نے اکتا کر کہا۔ اب وہ مخالفت نہیں سننا چاہتا تھا۔

"کچھ ہی کہہ لو۔"

بے چینی سے بچنے کے لئے اس نے دہرایا۔ "ہم لوگ قطعی شکریہ ادا

کرنے کے قابل نہیں ہوتے ۔۔۔ آج کل تو سب کی ہی ایسی حالت ہے۔ پھر بھی ہم کتنوں سے بہتر ہیں۔ ویسے آدمی کسی بات پر سیر نہیں ہوتا۔"

"سیر ہونے کی بات ہی کون سی ہوتی ہے۔" اس کی بیوی نے چڑ کر کہا۔

بڑی سڑک پر آکر جیسے وہ ایکا ایکی نئی دنیا میں آگئے تھے۔ جہاں شور و غل، چیخ و پکار سن کر وہ سنبھل گئے۔ بچوں کو انہوں نے اپنی انگلیوں سے بھینچ لیا۔ اقتصادی ماحول میں ہر چیز کو اپنا لینا ایک بہت دلچسپ بات ہے۔ اور اپنائے ہوئے اعداد کو بھینچ لینے کی از حد کوشش ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو سوچنے کے لئے بازار میں نہیں آیا تھا کہ اتنے شور و شغف کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے اہتمام کے ساتھ بیسیوں رکاوٹوں سے الجھنے کا فائدہ، ایک بیکار سی بحث تھی اور وہ چند لمحے سیر کرنے آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ذہنی رکاوٹیں اس شور و غوغا میں بھول سکیں۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی، بچے تھے اور اس ماحول میں وہ چل سکتا تھا۔ دیکھ اور سن سکتا تھا۔ یہی کافی تھا۔ اس سے زیادہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔

دوکانوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کا مال پڑا تھا۔ اس سے اسے کوئی غرض نہ تھی۔ اتنے مال میں سے وہ محض ایک نامعلوم حصّہ خرید سکتا تھا۔ اور ایسے کتنے حصّہ دار مجموعی طور پر ایک دوکان کو خرید سکتے تھے۔ اور اندر بیٹھا ہوا ایک آدمی اتنی سب رقموں کا مالک تھا۔ شاید اسی لئے وہ ان سب سے بڑا ہو لیکن اتنے مال کو اکیلا خرید لینے سے فائدہ بھی کیا ہو سکتا تھا۔ اس میں بڑپن کی کوئی علامت نہ تھی۔

اچانک اس کی بیوی نے سوال کیا۔ "کتنے بجے جانا ہے آپ کو۔؟"

"ابھی کافی دیر ہے۔"

ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس نے وقت کا اندازہ لگایا۔ یہ

ایسا سوال تھا کہ اسے بھی کپکپی محسوس ہوئی۔ سب واقعات کے پیش نظر وہ گھبرانے لگا تھا، تاہم یہ ایک اہم مسئلہ تھا۔ اس کا اپنا کام تھا۔ فی الحال اسے اس بات کی فکر تھی کہ وہ موجودہ رکاوٹوں کو سر کرے لیکن اس مسلسل مسئلہ کے بارے میں اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ جب وہ کوئی کام ہی نہیں کر رہا تھا، پھر اس طرح لوگوں سے مانگ کر تو ساری عمر کس طرح گزار سکتا تھا۔

لیکن ہمیشہ اسے موجودہ مسئلوں کے حل کرنے کی فکر ہوتی تھی۔ آئندہ کو وہ ہمیشہ کسی دوسری طاقت کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتا۔ وہ تو حال کو اسی کے سپرد کر دیتا، پھر گویا اس کی خاطر انتظام کرنے کی کوشش کرتا جیسے اسی کے احکام بجا لاتا ہو۔ ایک تسکین تھی۔ اپنی بیوی سے مختلف، وہ کبھی بے چین یا کم حوصلہ نہ ہونے پاتا۔ اس دوسری طاقت کے خلاف سننا تو بڑی بات تھی۔ وہ دوسروں کی طرف سے بھی خود ہی معافی مانگ لیتا۔ مبادا اسے ہی اس جرم کی سزا مل جائے ـــــ لیکن پھر بھی کھٹکا دور نہ ہو سکتا۔

جب کبھی ہر جانب سے وہ ناامید ہوتا تو یکدم کام بن جاتا! پھر وہ پر زور الفاظ میں کہتا۔

"ہم انسان ہیں نا۔ احسان فراموش ـــــ" اس کی بیوی سدِ راہ بن جاتی۔ پھر وہ کچھ کہہ سکتا نہ سن سکتا۔ لیکن در دلی طور پر وہ اس کے خیالات کو بہت اچھا سمجھتا۔ نجانے کیوں جیسا وہ خود سوچتا تھا۔ دوسرے نہیں جانتے تھے۔

اس کی جیب میں چند روپے تھے۔ یہ بوجھ وہ جلد از جلد نکال دینا چاہتا تھا۔ اس روز اس کے چچا نے اس کے یہاں صبح کا کھانا کھایا تھا۔ جاتے وقت وہ بدلہ چکا گیا تھا۔ اس طرح وہ کچھ کہہ سکنے کے قابل ہوا تھا۔ اس کے چچا کو علم تھا کہ وہ کسی سے اب نہیں کہہ سکے گا کہ اس نے چچا کو کھانا دیا۔ چند روپے ہاتھ میں تھما کر

اس کے چچا نے گویا۔ اس کے منہ کی بات خود چھین لی تھی۔ اس حرکت سے اس کا مطلب یہ تھا کہ جہاں وہ روٹی کھانے کا چرچا سنے گا جھٹ ثبوت پیش کر کے اسے کر سکے گا۔ اور اگر کسی کو علم نہ ہو سکا تو وہ خود کہے گا ــــــ صبح میں اس کے گھر کھانا کھانے پر مجبور ہو گیا۔ واپسی پر میں نے اسے پانچ یا دس روپے دے دیے تھے۔ یہ اس کی بزرگانہ شفقت تھی۔

وہ خود اپنے چچا کا احسان مند تھا۔ کون کسی کو پوچھتا ہے؟ اب وہ روپے اسے خرچ کرنا تھے۔ اس وقت وہ اپنے چھوٹے سے کنبے کی کتنی ضروریات پوری کرنے کے قابل تھا۔ ہر روز دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بلوں والے اس رقم کے مستحق نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے ان کے لئے انتظام کر دیا تھا۔ کسی کو اس نے پرسوں بلایا تھا، اور کسی کو چار روز بعد ــــــ اب وہ بازار میں سیر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی، بچے تھے، جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے بیویاں یا بچے تھے۔ اور فرق محض یہ تھا کہ وہ ان کے دل بہلاوے کے لئے چیزیں خرید رہے تھے اور وہ انہیں دیکھ رہا تھا اور اس کی بیوی اور بچے اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ازل سے وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے کے عادی ہو گئے تھے۔ دو فرلانگ دور ہی سے وہ ان سے باتیں کر سکتا تھا۔ اور وہ فاصلہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اسے کم کر دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اپنے تصورات کا نہیں، تو کم از کم وہ اپنے گھر کا مالک تھا۔ یہ اس کی بیوی تھی اور اس کے بچے تھے۔ وہ انہیں کاٹ کر اور ٹکڑے کر کے پھینک بھی دے تو وہ ان کا مالک تھا۔ اور وہ تو بہت نرم دل آدمی تھا۔ اسے اپنے گھر سے محبت تھی۔ وہ انہیں مسکراتے دیکھنا چاہتا تھا۔ گو اس بات کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا کہ اس کی بیوی خوش نہ ہو سکی تھی۔ وہ کام کرنے کے قابل تو تھا لیکن کوئی کام تھا ہی نہیں۔ اس نے بہت کوششیں کی تھیں۔ اپنا ذاتی روپیہ برباد کر چکا تھا۔

بلکہ لوگوں سے مانگ مانگ کر کام کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ بے چارہ رہ تھا۔ اب اس کا ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک مانگنے چلا جاتا۔ موجودہ مشکلوں سے نجات ہو جاتی۔ کل پھر رقم واپس کرنی تھی۔ جس کے لئے وہ پھر جان پہچان والوں کے چکر کاٹنے لگتا۔

اس میں اور بھکاری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ محض وہ فیشن ایبل سوٹ بوٹ سے لیس، صاف شفاف کپڑے پہنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ "بابو پیسہ" کی رٹ بھدی آواز میں نہیں لگاتا تھا۔ سلیس اور بامحاورہ زبان میں وہ اپنی ضروریات مشکلات اور موجودہ بے بسی کا رونا رو دیتا۔ پھر جلد واپسی کا وعدہ کر کے مدد مانگتا۔ رحم دل لوگ اس کی مدد کر دیتے۔ کیا پتہ کل انہیں بھی ضرورت پڑ جائے اور اس وقت کی نفی سے کل انہیں بھی خدا خالی ہاتھ لوٹ جانے کی سزا دے۔ چپکے سے وہ اس کے ہاتھوں میں نوٹ پکڑا دیتے لیکن وہ وقت پر رقم واپس ضرور کر دیتا۔ یہی اس کی دیانت داری اور خوش اخلاقی تھی۔ ورنہ وہ اس بار بھی ناکام رہتا۔

اور اسے بل مانگنے والوں کے تقاضوں کی اب کوئی فکر نہ تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سرخی بھی بادلوں میں معدوم ہو جائے گی۔ اور پھر آسمان سیاہ ہوتے ہی اسے رقم مل جائے گی اور یہ دس روپے بے سود تھے ان کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر بھی اتنی کم رقم میں کوئی چیز، بیوی بچوں کے لئے وہ نہیں خرید سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں کتنی لمبی چوڑی فہرست تھی۔ کتنی چیزوں کی انہیں بہت ضرورت تھی۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار کو مندا دیکھ کر گھبرائے ہوئے تھے، اس سے اس کے بزنس میں بھی رکاوٹ ہو رہی تھی۔ پھر بھی۔ اس نے اتنا بندوبست کر لیا تھا کہ نہایت ضروری چیزیں خریدی جا سکیں۔ اپنی حالت

دیکھ کر اسے یہ حیرت ضرور ہوتی کیتنی عزت اور آسانی سے وہ وقت کاٹ رہا تھا۔ بھلا اس کے بس میں یہ سب کچھ تھا۔؟

لیکن اس وقت وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں ضرور تھا جس سے وہ سب لطف اندوز ہو سکیں۔ اس نے چھ رومال خریدے، اپنے لئے جرابوں کا جوڑا ضروری تھا۔ اس کی بیوی خاموش رہی۔ پھر اسے اس کا خیال بھی آیا۔ اس نے ڈھونڈھ کر تین رومال اس کے لئے بھی پسند کئے۔ اس وقت اس کی بیوی نے تند لہجہ میں کہا۔ "کیا کر رہے ہو۔ اتنے پیسے بھی ہیں۔"

غیر دلچسپ فضا سے بچنے کے لئے اس نے وہ رومال وہیں رکھ دیئے۔ باقی چیزوں کی قیمت دے کر وہ باہر آ گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "رومال لینے میں زیادہ خرچ کہاں ہو جاتا۔"

"امید تو کہیں سے نہیں۔ پھر بھلا اس طرح خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس کی بیوی نے اسے سمجھانا چاہا۔

"تمہیں بھروسہ تو ہے ہی نہیں ۔" اس نے ذرا چڑ کر کہا۔ "امید کیسے نہیں، آج شام کو مل جائیں گے۔ ہم لوگ دراصل بے حد ——"

"جب تک ہاتھ میں نہ آجائیں —" اس کی بیوی نے فیصلہ کر دیا۔

لیکن یہ کوئی پہلی بار نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے عادی تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ ان روپیوں کو خرچ کرنا چاہتا تھا۔ کہیں بھی سہی۔ وہ اپنے بال بچوں کو دنیا کی طرح مزے لیتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا بھی دل تھا۔ ساری دنیا ہنستی کھیلتی جا رہی تھی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ محض اس لحاظ سے بدقسمت تھا۔ ایک بار پھر وہ دوسروں سے اپنا مقابلہ کرتا۔ پھر اگر وہ شکر ادا کرنے لگتا۔ یہ بھی بہت ہے بہت کافی ہے۔ وہ ان سب کو ایک ریستوران میں لے گیا۔ "کوئی بات

نہیں پھر کیا ہوا ۔۔۔۔ ؟" اس نے بیوی کو خاموش کر دیا۔ انہوں نے کافی لطف اٹھا لیا۔ وہ بھول گئے کہ ان کے پاس بہت محدود رقم ہے۔

بل ادا کر دینے کے بعد اس کی جیب میں محض چار آنے باقی رہ گئے تھے۔ بچوں کو ہنستے دیکھ کر اس کا دل بھر آگیا۔ اگر وہ ایک مضبوط دل کا مالک نہ ہوتا تو جانے کیا کر بیٹھتا۔ اپنی حیثیت سوچ کر اس نے بھی فخر محسوس کیا۔ وہ کچھ نہ کچھ تو کر سکا تھا۔ بلکہ بہت کچھ۔۔!

اس بار جس سے اس نے مدد مانگی تھی وہ اس کے نزدیکی رشتہ داروں میں سے تھا۔ اسے اس بات کا احساس تو تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت وہ کہیں اور تلاش بھی نہ کر سکا تھا۔ اپنے آپ کو اس نے سمجھا لیا تھا کہ اس میں حرج ہی کیا تھا۔ ضرورت ہو ہی جاتی ہے۔ اس کے گھر تک پبلک بس جاتی تھی۔ دیر ہونے کی وجہ سے وہ پیدل جانے سے زیادہ بس استعمال کرنا چاہتا تھا۔ واپسی پر اس کی بیوی نے تانگے میں آنے کی تاکید کی تھی۔ اگرچہ اس کا ایک بڑی طاقت پر ایمان تھا۔ لیکن احتیاط میں کوئی حرج بھی نہ تھا۔ رات کے وقت وہ علاقہ کم رونق ہو جاتا تھا ۔۔۔۔ اتنی بھیڑ میں اسے کسی چیز سے انس نہیں تھا۔ دھلتے دل کے ساتھ وہ محض ایک فرد کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کا عکس اس کے دل اور دماغ پر پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ یہ بڑی مدد تھی۔ اس کے بیسیوں کام نکل سکتے تھے۔ پھر کم از کم تین چار مہینے وہ آرام سے گزار سکتا تھا۔ اور اس وقت اسے ان لاکھوں کروڑ دل انسانوں میں سے ایک کی ضرورت تھی۔ وہ محض خاک کے ذرّوں کی طرح تھوڑی دیر تک اس کی آنکھوں میں اٹکتے تھے پھر ایک طرف سرک جاتے تھے۔ وہ ان سب کو دیکھتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت وہ کسی بھی غریب کو دیکھ کر پسیج جاتا۔ ایک دم اس کے خیالات دعا کے لئے بندھ جاتے۔

وہ بار بار شکر یہ ادا کرتا جیسے وہ بے سمجھ ہو گیا ہو۔ جیسے اسے اس کے علاوہ کچھ آتا ہی نہ ہو۔ وہ بار بار اپنے ہر طرف دیکھ لیتا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اسے خوف اس بات کا تھا کہ رات کے وقت کوئی اتنی رقم اس سے چھین نہ لے۔ اس کے گھر کے نزدیک ہی ایک تانگہ کھڑا دیکھ کر وہ جلدی جلدی چلنے لگا تاکہ وہ وقت پر آکر تانگے تک پہنچ سکے۔ اگر کسی نے تانگہ بلا لیا تو پھر یہ بھی ایک نئی مشکل ہو جائے گی۔

اندھیرا کافی ہو چکا تھا۔ بنگلوں کے باغیچوں میں بھی خاموشی تھی۔ شاید مالی نے گھاس میں پانی دیا تھا۔ اور مینڈکوں نے ٹرانا شروع کر دیا تھا۔ اس اندھیری رات میں پانی کے کنارے بیٹھے مینڈک وہی فرحت کے نغمے گا رہے تھے۔ یہ نغمے ہزاروں برسوں سے گائے جا رہے تھے۔ جب آدمی کاری ضرب کا احساس کرتا ہے تو مینڈک زیادہ شور و غل سے گانے لگتے ہیں۔ پھر ان کے نغموں میں کوئی لطف نہیں رہتا۔ ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایک خوف ہوتا ہے۔ شاید یہ احساس ہمارے اپنے ذہن کی ساخت ہو کیونکہ ایسے موقعہ پر کوئی تفریح طبیعت میں نہیں جچتی، ہو سکتا ہے اسی لئے وہ ان باتوں کا خیال کئے بغیر آگے بڑھتا گیا۔

فلیٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ بے ربط سوچتا ہوا زینے تک پہنچ گیا۔ نیچے اس کا نوکر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر پوچھا۔

"صاحب ہیں ــــ؟"

"نہیں تو ــــ"

یہ پہلا اور شاید آخری دھچکہ تھا۔ "کیوں۔"

"وہ تو باہر گئے ہیں۔ ہفتے کے لئے ــــ" اس نے واضح کر دیا۔

"بی بی جی اوپر ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر تک وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔ نوکر بھی ناپسندیدگی

سے اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ ہر کوئی دخل اندازی کا سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے۔ فرصت کے چند لمحے۔۔۔۔۔۔

بات معمولی تھی کیونکہ وہ ہفتے تک کے لئے کہیں دوسرے شہر میں چلا گیا تھا۔ جب وہ واپس لوٹے گا۔ تو ضرور اس کے ہاتھوں وہ چند نوٹ دیدے گا۔ اس کی امید میں کوئی فرق نہیں آسکتا تھا۔

ہفتے بعد ـــــ گویا اس نے بلایا ہی ہفتے بعد تھا۔ وہ آج جیسے اس کا مزاج پوچھنے چلا آیا تھا۔ اپنے گاہک کی چاپلوسی کرتے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہی صورت تھی۔ لیکن سوال تو ان آنکھوں کا تھا۔ جنہیں اس نے تین یا چار روز کی مہلت لے کر ٹالا تھا۔ ان زبانوں کی کپکپاہٹ ایک دہشت ناک معجزہ تھی جادوگری کی ایک عمدہ مثال تھی۔ وہ ہاتھ اسے ڈھونڈ لیں گے۔ اس کا گریبان ـــــ اسے اپنے سفید کالر کی فکر تھی۔ ہاتھوں میں مسوس کر اس کی اکڑ بالکل بیٹھ نہ جائیگی۔ شاید اسی لئے پہلے سے اس کا گلا درد کرنے لگا تھا۔ گریبان یا کالر دن تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اس بارے میں اسے یقین نہ تھا۔ پھر بھی کیا پتہ۔۔۔۔۔۔۔ کیا پتہ۔۔۔۔۔

پھر وہ کیا کرے۔ ایک سنجیدہ، دنیادار آدمی ایسی حالت میں کیا کرے جب واپس جانے کے لئے جیب میں بس کا کرایہ بھی نہ ہو۔ ان قرض خواہوں کے بارے میں وہ کیا کرے ـــــ پرماتما ـــــ بھگوان ـــــ ایک مجسمہ، چاندی کی طرح دھندلا دھندلا پرچھائیں۔ جانے وہ کیا سمجھا تھا۔ کیونکہ جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا۔ اس کے سامنے عملی طور پر ثابت کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا اعتقاد ـــــ اس کی دعائیں ـــــ کسی طور پر بھی کوئی کمزوری نہیں رہ گئی تھی۔ اور وہ پھر اپنے اس عملی ثبوت سے کیا

اخذ کرے۔

یہ ایک لمبی چوڑی، طویل بحث تھی۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ اس کے گھٹنوں میں وہ بل نہیں تھا۔ اس کی کمر میں پھرتی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ لٹکے ہوئے تھے۔ مینڈک ٹرا رہے تھے۔ رات کی سیاہی، پانی کے کنارے، باغوں میں شفاف چاندنی کے خیالات کی ہواؤں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ صبح ہی پیٹ میں گڑگڑاہٹ شروع ہو جائے گی۔ اور بل لینے والے اسے پریشان کرنا شروع کر دیں گے۔ پھر مینڈک دبک جائیں گے یا ڈھیٹ ہو کر اچھلنے کودنے لگیں گے۔ پھر یہ نغمے بھی نہ نکلیں گے۔ کیونکہ وہ سیاہی میں ہی بول سکتے ہیں۔ چیخ چیخ کر مستی کی دعوتیں دے سکتے ہیں۔ لیکن انسان کے لئے آخر میں وہ بھی شکست کھا جاتے ہیں......

اور وہ بازار کے نزدیک پہنچ رہا تھا۔ وہی شائیں شائیں جیسے دریا کے کنارے چند لمحہ رہ کر وہ اس آواز میں گڈمڈ ہو چکا ہو ـــــ وہ کیا کرے، سوال تو یہ تھا۔ وہ اب کونسی صورت نکالے۔ چار میل پیدل چل کر گھر پہنچنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اور جیب میں دو پیسے مل کر ہلکی سی جھنجھن بجا رہے تھے۔ یہ اس کے بھگوان کی آرتی تھی۔ شکر یہ تھا اور وہ دو پیسے بالکل ناکارہ تھے۔ وہ اپنے بے سود ہونے کا احساس کر دا رہے تھے۔ حالانکہ اس کی قطعی ضرورت نہ تھی اور اس کے گھر بار کا خرچ......؟

اس ایک لمحہ میں وہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ بھگوان سے دعا کرے یا انسان سے۔

لیکن اب اسے غصّہ تھا۔ اب وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ ننھے ننھے بچوں کے سوکھے منہ ـــــ لیکن وہ کیا کرے۔ وہ پھیل کر سو جانا چاہتا تھا۔

وہ آخر کیا کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ وہ بھول گئے تھے۔ کوئی راہ تھی ہی نہیں
وہ بے بس تھا۔ وہ یہی الفاظ اپنے بچوں سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی کو سنا دینا چاہتا تھا۔
جیسے ہماری زمین سوکھا منہ بنا لیتی ہے۔

اور بھگوان۔ اب بھگوان سے بھلا کوئی پوچھے تو ـــــ بھگوان ـــــ

اسے رونا آرہا تھا، جانے کس پر۔ اس کے سامنے بس آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سہارا لے کر
اندر جھانکا۔ کتنی سیٹیں خالی تھیں۔ بس خالی چل سکتی ہے۔ لیکن آدمی نہیں بیٹھ سکتا۔
کیونکہ اس کی جیب میں محض دو پیسے ہیں یا کبھی بارانے بھی نہیں۔ مگر کیوں نہیں۔ وہ
ضرور بیٹھے گا۔ وہ پیسے مانگنے والوں کی زبان کھینچ دے گا کیونکہ بھگوان نے ان کے منہ تبدیل
کرنے کی توفیق نہیں دی، کیونکہ وہ بے بس تھا۔ عملی دنیا میں اس کے پاس کوئی وجہ نہیں۔
کہ وہ کچھ بھی کر سکے لیکن وہ حیران ضرور تھا۔ بھلا اعتقاد اور سارے خیالات ایک
چٹان سے ٹکرا کر وہیں رہ سکتے تھے۔ ؟ وہ کیا سمجھے۔ ؟ وہ سوچ نہیں سکتا تھا۔

بس میں اور لوگ بھی چڑھے تھے۔ وہ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس
نے بالکل نہیں سوچا کہ اس بات کی عملی حیثیت کیا ہو سکتی تھی۔ ایک بغاوت تھی۔
ہر جنس کے خلاف، ہر تخیل کے خلاف، کیونکہ بخارات پانی بن بن کر ٹپک پڑے تھے۔
یہ عملی اور حقیقی پہلو تھا۔ لیکن اسے کسی نے مخل نہیں کیا۔ اپنے مقام پر پہنچ کر وہ اٹھ
کھڑا ہوا۔ کسی نے اس بات کا بھی خیال نہیں کیا۔ خود اس نے کسی کا جائزہ نہیں لیا کہ
کوئی اسے دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں۔ اس سے پہلے اترنے والا آدمی بہت دیر کر رہا تھا۔
اور اس رکاوٹ سے وہ زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔ اگر اس وقت کسی نے اس سے
پوچھ لیا کرایہ دیئے بغیر اتر جانے پر اس کی کتنی بے عزتی ہو سکتی تھی۔ وہ فوراً ہی
نیچے اتر جانا چاہتا تھا۔

"ذرا رکیے ــــ" اس آدمی نے کرسے پٹنے سے اسے کہا "صبر کیجئے"

لیکن وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔ کیا پتہ کوئی اسے ٹکٹ کے بارے میں ہی پوچھ بیٹھے۔

"تم ہو ـــــ" اس آدمی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "کہاں سے آرہے ہو۔" اپنے چچا کو پہچان کر وہ اور بھی گھبرا گیا۔ اتنی دیر تک وہ دونوں بس سے نیچے اتر چکے تھے۔

کنڈیکٹر نے اسے مخاطب کیا۔ "آپکا ٹکٹ۔"

"اچھا، تم نے ابھی ٹکٹ نہیں لیا۔" اس کے بوڑھے چچا نے جلدی سے کہا۔ "بھئی، ان کے ٹکٹ کے پیسے کاٹ کر باقی مجھے دے دو۔"

یقیناً وہ معجزہ تھا۔ اس کا چھپایا دو پیسے!

کافی دیر وہ سر جھکائے وہیں کھڑا رہا۔ پھر کوشش اور صبر کے باوجود رات کی سیاہی کے پردے میں وہ کافی دیر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا ـــــ

لڑکی لڑکا جذبے

اس نے اپنے گلے کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے کر بھینچا۔ اتنا کہ اس کے چہرے کی رگیں، نسیں، آنکھوں، کانوں اور ناک تک پھٹتی محسوس ہوئیں۔

جیسے پھانسی کے پھندے کو گلے میں ڈال کر مجرم کو لٹکتا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس احساس کے لئے اس نے گرفت زیادہ سخت کر دی ——— یہ بھی ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ خودکشی کا۔

اس نے محسوس کیا کہ اسے تکلیف نہ ہو گی۔

تکلیف ہوتی کیونکر۔ جوش اور شدّت سے ابھرتی نسیں اس کے ابلتے کھولتے اور پھوٹتے جذبات کا عملی جواب تھیں۔ جس طرح پھانسی کے دوران میں نسیں پھول جاتی ہیں اور اس انتشار کے بعد مکمل سکوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خودکشی کی مشق کرتے ہوئے اس کے جذبات کو پوری تسکین مل رہی تھی۔ آنکھیں ابل رہی تھیں اور حلق سوکھا ہوا تھا۔

چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک اعلان کے ذریعہ سب کو بتا دینا تھا۔

وہ کچھ ایسی خوبصورت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی۔ اس نے بارہا بلکہ روزانہ

اپنی صورت کا معائنہ کیا ہوگا۔ اسے اپنے ماتھے کا دایاں حصّہ بائیں سے زیادہ تنگ

اور ابھرا ہوا معلوم ہوا ہوگا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو دیکھا ہوگا۔ اس کی آنکھیں

اوسط قسم کی تھیں اور ان میں اسے کرختگی، سختی اور محدودیت کا احساس ہوا ہوگا

اور پھر لاشعوری طور پر اس نے رومال سے یا انگلیوں سے انہیں صاف کر لیا ہوگا۔

——— نجانے ناک پر سفید سفید مسام کیا ہو جاتے تھے ——— اکثر وہ

تولیے کے سخت پہلو سے یا ناخنوں سے انہیں رگڑتی تھی اور صاف کرتی تھی۔

اسے کسی نے مشہور، خوبصورت اور اونچے درجے کی عورتوں سے

تشبیہ دے کر بلایا تھا۔ قصوں کی عورتیں گوری چٹی اور پریوں کی طرح بے عیب محسوس

ہوتی تھیں۔ ان کے شہر، ان کی گلیاں، ان کے مکان مکمل طور پر نفیس اور صاف

ستھرے لگتے تھے۔ وہ اپنی شکل کا مقابلہ کرتے ہوئے یقین کرنا چاہتی کہ وہ اس کے

جذبات اسی قدر قدرتی سنجیدہ اور جائز ہیں۔ اور اسے یہ دیکھ کر کوفت ہوتی

تھی کہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر بھی پیڑی کو ختم کیا جائے۔ اس کے ہونٹ خوبصورت

تھے لیکن یہ خامیاں ——— کمزوریاں ——— ہر کسی میں ایسی کمزوریاں۔ بدصورتیں ہوتی

تھیں اور جب وہ کسی کی جید تعریف سنتی۔ حسن کے چرچے سنتی اور جا کر دیکھتی تو

اسے بیحد پریشانی اور تکلیف ہوتی کہ اس حسین چہرے کے گالوں پر سبزہ کیوں ہے۔

ٹھوڑی کے نیچے اور گردن کے پاس، اوپر کے ہونٹ کے گرد بیشمار ننھے ننھے رونگٹے۔

ایسا لگتا تھا کہ کوئی نہ ہوگا جو ان مشہور افسانوں کے مطابق مکمل طور پر بے عیب

دکھائی دے۔

اور اس کے باوجود کہ اس کے منہ میں غذا اور خوراک کے تاثر کی

عجیب ہلکی ہلکی بساند اکثر رہتی تھی۔ گو وہ لاکھ کوشش کرتی کہ اس کے سانس میں کافور جیسی خوشگواری ہو۔ اور اس کے باوجود جب کسی کو اس میں عطر جھلکتا محسوس ہو، تو اپنے پر بھروسہ ہو سکتا تھا۔ اور یہی وہ چاہتی تھی کہ ایسے احساس والے آدمی پر قربان ہو سکے جسے اتنی اچھائیاں، اتنی باریکیاں اس میں نظر آجاتی تھیں، اور یہ اسے معمولی بات نہ لگتی تھی۔

اچھا، اس سے کیا، اسے وہ آدمی پسند تھا۔ اس میں سب ہی اوصاف تھے۔ چھدرے جسم کا، گندمی رنگ کا۔ خوش سلیقہ اور اچھے خاصے نقوش تھے ـــــ اس کی ہنسی کی لہریں گو وہ بڑے زور سے قہقہے لگاتا تھا۔ لیکن یہ بات درگزر کی جا سکتی تھی۔ عموماً وہ شام کو ہاکی کھیل کر گزرتے ہوئے اسے ملتا تھا۔ اس کے نزدیک کھڑے ہو کر، اس کے بدن سے پسینے اور میلے کپڑوں کی بو قدرے محسوس ہوتی تھی لیکن نہانے کے بعد، ہو سکتا ہے کہ بو ختم ہو جاتی ہو۔ آخر وہ کھیلتی نہ تھی۔ کوئی اٹھنے بیٹھنے کا کام یا مشق وہ نہیں کرتی تھی اور پھر بھی شام کے وقت اب اس کے کپڑوں میں یا اس کے جسم سے ہی ہلکی ہلکی بساند نکلنے لگتی تھی اور یہ کپڑے وہ تین چار روز تک پہنتی تھی۔ ــــــ اس بارے میں کیا کیا جا سکتا تھا۔

تو آخر کیا یہ صحیح نہ تھا کہ اسے شادی کر کے اپنا گھر بسانا تھا۔ عام قاعدے کے مطابق اسے بھی کسی سے وابستہ کیا جانا تھا اور جب ایک شخص بارو زگار ہو ــــ وہ ایک خوش مزاج شخصیت کا مالک ہو۔ ایک اچھا کھلاڑی ہو جو معمول سے کھیل کے میدان میں ہاکی کی مشق کے لئے جاتا ہو اور اہم بات یہ تھی کہ اسے ہاکی سے والہانہ دلچسپی تھی۔ اسے ایک خوش مزاج شخص کی بات چیت کی خاصی کشش معلوم ہوتی تھی۔ اور اس قسم کے بنک اور سنجیدہ لوگ عام طور پر مشکل سے ملتے تھے۔ اور اس کا کام ــــ ــــ اسے ریلوے کے بابوؤں کی طرح بھدی وردی میں سارا دن

خاک چھاننی نہ پڑتی تھی اور بدتمیز اور اجڈ لوگوں سے خاص تعلق نہ رہتا تھا ———
اور وہ ایک ایسا گھر اپنے لئے چاہتی تھی جہاں وہ اپنے لئے بہترین ماحول دریافت کر سکتی۔

وہ اسے چاہتی تھی۔ اسے محبت کرتی تھی اور اگر بہ معمولی خامی کے باوجود اسے آپ ہی نما اور چاند جیسے حسین اور لطیف خیالوں میں باندھنے لگیں تو وہ کھلم کھلا کہنے کو تیار تھی کہ وہ ایسے شوہر کے بغیر زندہ رہنا ناواجب اور ظلم سمجھتی تھی اور وہ اسی لئے بار بار اپنے گلے کو ہاتھوں سے دبا کر خودکشی کی مشق کیا کرتی تھی۔ کبھی اوپر کی چھت سے سڑک کو گھورا کرتی تھی۔ کبھی گلی کے نکڑ پر کوئیں کی گہرائیوں میں سیاہی کو چیر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ کبھی وہ منجھی ریل گاڑی کی دندناتی آواز سے انجن کے بڑے بڑے پہیوں کو پٹری پر بوجھ ڈالتے تصور کرتی تھی۔ موٹر یا لاری کا خیال عام اور مجرب تھا کیونکہ اس میں خودکشی کی تھرتھراہٹ کم اور حادثے کا خدشہ زیادہ ہوتا تھا۔ صحیح زہر کا ملنا مشکل تھا۔ اور ذہن پر ویسے بھی دردِ عمل الف لیلیٰ کے قصوں کا ہو جاتا تھا۔ وہ اس بارے میں ایسی کوشش کے معاملے میں بجید سنجیدہ تھی، بجید ناتجربہ کار تھی۔

کرسی پر کروٹیں بدلتے اس نے اکتا کر دروازے کے دوسری طرف اپنے گھر والوں کے اچھلنے کودنے سمائے دیکھے۔

وہ کیوں اس کی بےکلی کو نہیں پہچانتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر اسے اکیلا چھوڑ کر تفریح میں مشغول تھے۔ اس نے اپنی ماں اپنے باپ اور اپنے پانچ بھائیوں کو دیکھا۔ وہ انہیں پیار کرتی تھی۔ اخبار پڑھتے باپ کی شفقت اور اس کے بجید سنجیدہ چہرے سے اسے ذہنی سکون ملتا تھا۔ ماں کی گود میں سر چھپا کر اس کے تمام خدشے کافور ہو جاتے تھے۔ اس کے بھائی بہن اسے لپٹ کر شفقت اور محبت کا عجیب اور

انوکھا پہلو دکھاتے تھے۔

لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنے کنبے کو بہت چاہتی تھی لیکن اسی لمحہ اپنے ذاتی جذبات کی رو میں بہہ سکتی تھی۔ ایسا کئی بار ہوا تھا۔ اور اس نے ایک وقت پر دونوں پہلوؤں کو یکساں چاہا تھا۔ مثلاً وہ شادی شدہ ہو۔ اور اپنے شوہر کے ہمراہ ان رشتہ داروں کو ملے۔

لیکن کہ۔ ڈرائیر کے لئے ہمت چاہیئے تھی اور ہمت جوش کی رو میں بہہ کر ہو سکتی تھی اور جوش اس قدر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن ایک دائرے میں بیٹھے خوشی سے دھوپ سینک رہے تھے۔ اور وہ دوڑ کر ان میں شامل ہونا چاہتی تھی۔

ادا اسے یاد تھا جب ایک دفعہ وہ اپنے نئے سویٹر بن رہی تھی اور اس کی انگلیاں پھرتی سے پوری رفتار سے دھاگے کو ایک سلائی سے دوسری سلائی میں لپیٹتی جاتی تھیں۔ وہ شخص آیا۔ وہ جھکا اور اس نے سویٹر کو اچھی طرح دیکھا۔ خود اس نے سویٹر کو پکڑ کر پھیلایا اور داد طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "کیوں۔؟"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "بہت خوب......"

کیا یہ قدرت کی ستم ظریفی نہ تھی کہ آرٹ کے مطالعے کے دوران میں جب وہ دونوں ایسے سنجیدہ اور اونچے ماحول میں تھے "بہت خوب" کے ساتھ اس کی آواز دب گئی۔ اس نے بہت کوشش کی اور اس کا چہرہ اس جد وجہد کو ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور ایک بوسیدہ ڈکار بھر کر اس نے سویٹر کو دیکھا۔ اپنی ایسی حرکت پر سخت نادم وہ وہاں سے ٹل جانا چاہتا تھا۔ قدر اور تعریف کی منزلیں گزر گئی تھیں۔

اسے ہوا میں وہ نامانوس آواز اور بساند یاد تھی لیکن اس لطیف

راحول کے یوں ختم ہونے کا افسوس نہ تھا کیونکہ اسی لمحہ فوراً قندھاری انار کی طرح وہ سرخ ہو گیا اور اس کے چہرے کی حیا پرکشش تھی!

اور وہ اسے پسند کرتی تھی۔ یہ ماننے کہنے اور حاصل کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی۔

تسلسل قائم ہو گیا تھا اور وہ خوشگوار دائرے میں جا کھڑی ہوئی "میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اور آپ کو بتانے میں اب کوئی حرج نہیں۔"

وہ سب چونک پڑے۔ اس کے باپ کے سامنے اخبار کی دیوار ریت کے پہاڑ کی طرح، پگھلتی برف کی طرح بہہ گئی۔ اس کی ماں، اس کے بھائی بہنیں اسے بغور دیکھنے لگے۔ "اب کوئی حرج نہیں۔ اگر آپ میری شادی کرنا چاہیں تو ——"

"ہم تیری شادی نہیں کر رہے۔" اس کے باپ نے اخبار کو سنبھالا "ابھی تیری بات نہیں کر رہے تھے۔ ابھی بڑے بابو کی بات کر رہے تھے۔ اس کی لڑکی نے ماں باپ کو صاف کہہ دیا ہے۔ کہ وہ دنیا میں ایک ہی شخص سے شادی کرے گی۔ وہ اپنی محبت کے قصے خود سنا رہی ہے۔"

اور وہ شخص کون تھا؟ کیسی عجیب بات تھی کہ وہی شخص کسی دوسری لڑکی کی ایسی حرکت کا موجب ہو۔

اس نے باپ کے بیچ چوڑے تھے کو ٹوک کر کہا "میں نہیں جانتی۔ میں کہوں گی کہ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں ——؟" اس کے باپ کو برا لگا۔ "جب کہ خود اس کا باپ میرے ساتھ باتیں کرتا رہا اور روتا رہا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے اپنا نقطہ پیش کیا۔ "وہ شادی نہیں کر سکے گی کیونکہ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے باپ اور ماں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ واقعی زلزلہ آیا تھا یا یک وقت ان کے دلوں کو دھچکہ لگا تھا یا ان کی بیٹی کا قصور تھا ——— اس کے باپ نے اپنے طبقے کے رسم و رواج کے مطابق اخبار کا سایہ لے کر کہا۔ "بے شرم ——" اور وہ اچھل کود کر بڑبڑانے لگا۔ اس کی ماں صاف صاف کہنے کی عادی تھی۔ "ایسی باتیں کون کرتا ہے۔ ابھی تو بڑے بابو کے قصّے سن رہے تھے۔ اسکی بیٹی کی زبان پر ہنس رہے تھے —— یہ حد ہو گئی ——"

حد ہوئی یا نہیں لیکن اس نے ایک بار پکّا خیال کرنے کے بعد ٹس سے مس نہ ہونے کی گویا قسم کھالی۔

وہ کبھی کبھی کئی سین سوچتی۔ اپنے آپ کو اس شخص کے ساتھ شادی کی رسموں کو ادا کرتے ہوئے اور ایک چھوٹا سا لیکن نفیس گھر بساتے ہوئے۔ اسے وہ سب شادی کے وقت کھڑے اپنے فرائض پورے کرتے دکھائی دیتے۔ اور اس کے بعد بھی۔

اس کا باپ سر پیٹنے کو تیار تھا۔ ہر وقت ہر کسی کو کوسنے کے لئے تیار تھا۔ وہ یقین نہ کر سکتا تھا کہ اچانک بیٹھے اور اخبار ہاتھ میں لئے دنیا کے قصّے سنتے سناتے ایک ایک روز اس کی بیٹی نے ایسی بات کہہ دی تھی جس سے وہ اپنے آپ کو برہنہ سمجھنے لگا تھا۔ جو ذہنی دیواریں اس نے کافی عرصہ سے بنانی شروع کی تھیں اور جو ایک کوئیں کی طرح، ایک تہہ خانے کی طرح اس کے بہت اوپر تک روشنی کو ختم کرتی رہی تھیں۔ اور ہوا اور زندگی کے شور و غل کو کہیں دور ظاہر کرتی تھیں۔ وہ اچانک ان حدود سے باہر نکال لیا گیا تھا۔ اور وہ یقیناً چندھیا گیا تھا۔

ایک جد و جہد تھی جبکہ وہ اپنے ارادوں کو ترک کرنے کو بالکل تیار نہ تھی۔ وہ سب اس نئے معاملے اور انوکھے انکشاف کو سمجھنے اور عادی ہونے کی تگ و دو میں تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ایسے ارادوں کو صاف صاف بتا دینے والی لڑکی اپنی

ماں سے لپٹ کر ماننا چاہتی تھی۔ باپ کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اس سے شفقت طلب کرتی تھی۔ بہنوں اور بھائیوں میں اس طرح کھلکھلا کر ہنس کر کھیلتی تھی جس طرح کئی سال پہلے وہ فراک پہنے کھیلا کرتی تھی۔ اور وہ سب بھول گئے تھے کہ ایسا صاف اعلان اس نے ان سب کے سامنے کیا تھا۔

اس نے بیوی سے بڑے کرب سے کہا۔" دیکھو۔ یہ پاکیزہ بیٹیاں جو ماں باپ پر قربان ہوتی ہیں۔ جو بھائیوں سے پاک عشق کرنے والی بہنیں ہیں اور آدمی ان کی نیکیوں اور صفتوں سے بلند لیوں پر پہنچ جاتا ہے اور گھر کی بنیادیں پختہ ہوتی ہیں۔ وہی بیٹیاں وہی بہنیں ایک بیگانے آدمی کی خاطر سارا ڈھانچہ بکھیر دیتی ہیں۔ اور بیٹی اور بہن کے رتبے کو یکسر بھول جاتی ہیں۔"

وہ اٹکی اور بڑوہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی بیوی جو دروازے کے نیچے ایک چیونٹے کی نقل و حرکت دیکھنے میں محو تھی، خاموش رہی اور اسے پتہ نہ چلا کہ وہ کیا کہتی ــــــ ان دونوں کی بے بسی ظاہر تھی کہ وہ لڑکی خوب کھاتی تھی۔ خوب ہنستی تھی اور ان سب سے پیار کرتی تھی جبکہ وہ بات کرتے کرتے ٹھٹھک جاتے تھے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ بیٹی زیادہ تھی یا بیوی۔

یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ حالات کا صحیح جائزہ لے سکتے تھے۔ اور سارا دن اپنا سکتے تھے۔ جب وہ ان کی گودیوں میں بچوں کی طرح آ گرتی تو وہ پرانے خلوص اور سکون کا ذائقہ لے سکتے لیکن جب کبھی موقعہ ہوتا تو وہ اس نئی بدبدلیں کھو جاتے

بڑے بابو کی حالت ان سے بدتر تھی کیونکہ وہ مکمل حاکم ہونے کی وجہ سے فرمانبرداری چاہتا تھا ورنہ ملنے پر پیچ و تاب میں ہوش کھو بیٹھتا تھا۔ وہ اس سے اپنی بیٹی کی حرکتوں کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اور ورنے لگتا تھا۔ کیوں۔ بڑا کا

اچھا نہ تھا۔؟ وہ تو اچھی تھا بلکہ بہت اچھا تھا لیکن یہ طریقہ اچھا نہ تھا۔ اور غلط طریقے نے صورت ہی بدل دی تھی۔ بڑا بابو رٹ کے کوپ نہ بھی کرتا لیکن اب جب کہ اس کی بیٹی نے اس کی بزرگی کا لحاظ نہ رکھا تو وہ اپنے کہے ہوتے انکار کو کس مجبوری یا درخواستوں کے اثر کی وجہ سے تبدیل کرتا ــــــ اس کو جو تکلیف تھی وہ ذہنی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح باپ کا عالی درجہ دینے اور اس سے رواج کے مطابق چھپنے کی بجائے اس کی لڑکی نے آنکھیں بھینچ کر اور چوڑی ناک کو اور پھیلا کر اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "اگر تم نہیں کرتے ہو تو ہزار بار نہیں کرو ــــــ میں اپنی شادی خود کر دوں گی، میں بالغ ہوں۔ سکول میں جو میری عمر تم نے غلط لکھوادی ہوگی اس کے باوجود میں بالغ ہوں۔ اور جو چاہوں کر سکتی ہوں اور کر رہی ہوں۔"

نازک خیال ہونے کی وجہ سے وہ اس لئے رو رہا تھا۔

کر رہی ہوں اور کر دوں گی میں فرق ہوتا ہے۔ مستقبل کے اشارے میں ایک ارادہ ہوتا ہے۔ لیکن کر رہی ہوں جیسے فعل حال میں ارادے کی پختگی بلکہ فوری تکمیل پر آمادگی ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہ اسی لئے چیخ رہا تھا کہ وہ لڑکی ادب کے لحاظ سے ہی اسے منانے کے لئے تیار تک نہ تھی۔

اس پرجوش فضا میں بڑے بابو سے اس نے بھی اپنے بے حد پریشان جذبات کو کھول کر کہنا چاہا اور اس نے کہا۔

"آپ ہی کیا، آج کل سب ہی ایک نازک مسافر ہیں۔ آپ بڑے آدمی ہیں اور آپکی بیٹی کو نئے رواج کے مطابق کافی آزادی ملتی رہی ہے۔ آپ نے کبھی پرہیز نہیں کیا تھا۔ چاپلوسی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے گنوانا غلط بات تھی ــــــ" لیکن میں پرانے خیالوں کا آدمی ہوں۔ میں نے اپنے بچوں کو بڑی

سختی سے پابندیوں میں رکھا تھا۔ اور اسی لئے مجھ سے سلوک ہوا ہے۔"
بڑا بابو اچک کر بیٹھ گیا۔ "کیا ـــــ کیا ہوا ہے؟"
"میری بیٹی ـ" لفظ اس کے گلے میں پھنس گئے۔ اور وہ اپنے خیالوں کو چہرے کے ڈوبتے ابھرتے جذبوں سے ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

بڑے بابو کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس کی ڈبڈباتی آنکھیں صاف ہوگئیں۔ اور کتنے عرصہ کے بعد اس کے چہرے پر بے فکری اور لاپرواہی نظر آئی۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سارا واقعہ کیا تھا۔

اس شخص سے سارا قصہ معلوم کرنا مشکل بات نہ تھی۔ وہ خود اپنی داستان سنانے کا خواہشمند تھا۔

لیکن پتہ لگانے کے بعد بڑے بابو کی برداشت نہ رہی۔ اس نے کہا ـــــ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں میں نے ساری بات سمجھا دی ہے۔ بری بیٹی اپنے ارادے سے کس طرح ہٹ سکتی ہے ـــــ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور دونوں چاہتے ہوں گے۔ اسی لئے میری بیٹی نے اس طرح میری پرواہ بھی نہ کی۔ جب کہ جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ محض سکول کی لڑکیوں کے جذبات والی بات ہے۔ اور یکطرفہ ہے۔"

"نہیں نہیں۔" اس نے یقین سے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیٹی سکول کی لڑکیوں کی طرح کس طرح ہوگی۔ بلکہ آپ ہی اس بارے میں مجھ سے زیادہ افسوس کرتے تھے۔"

بڑا بابو اس مقابلے سے بے قابو ہو کر سنجیدگی سے بارعب آواز

میں بولا۔ "لیکن میں نے لڑکے کے متعلق آج تک کبھی کوئی حرف نہ کہا ہوگا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری ایسی حالت ہے ورنہ مجھے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔
———؟"

یہ سن کر اس نے اس کے سوا زیادہ یا کم نہ چاہا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے۔ "میری ایسی حالت ہے۔ ! کیا حالت ہو گئی میری۔" اس نے چلا کر کہا۔ وہ کمبخت بوڑھا بڑا بابو جو ہر وقت ٹسوے بہایا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی نے اس کے رتبے کا لحاظ نہ رکھا تھا، اس کے جذبات کا پاس نہ رکھا تھا، اس کی عزت مٹی میں پلید کر دی تھی۔ اب اکو باتوں سے جل گیا تھا۔ آنکھیں پھیرنے لگا تھا۔ بلکہ اپنی بیٹی کی محبت کی گہرائیوں کو تولنے لگا تھا۔

"اگر تمہیں اتنا ہوش ہی نہیں کہ تمہاری حالت کیا ہو گئی ہے تو میں بتا کر کیا کروں۔ ؟" بڑے بابو نے لاپرواہی سے کہا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔

"اور اگر تم نے میری باتوں سے ہوائی قلعے بنانے کی کوشش کی ہے اور خود یہ سب قصہ ایجاد کیا ہے تو بھی تمہیں شرم آنی چاہیئے۔"

اگر وہ ایک گھونسہ ہی مار بیٹھتا۔ ایک تھپڑ ہی لگا دیتا۔ تو اس کے مستقبل میں ایک عجیب ردعمل ہو گیا ہوتا۔ صحیح ہے کہ لوگ ایسے موقعوں پر یا اس سے کسی کم درجہ واقعات پر دست درازی کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے بڑا بابو نہیں ہوتا۔ اور بڑا بابو اسی قابلیت کی وجہ سے اونچے درجہ پر تھا اور نبھا رہا تھا۔ کیونکہ طیش اور حیرت نے گویا سوکھے حلق کے علاوہ وہ خود ایسی بکواس کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ ہکا بکا

اپنی بیٹی اور اپنے خاندان کی تزئین کو سن رہا تھا ——— اسے ایک خط بھی لکھنا ہوتا تھا تو وہ پہلے اس پر ناک کھینچتا تھا۔ اس کی کاٹ چھانٹ کرتا تھا۔ اور پھر خوشخط لکھنے سے پہلے دوسرے کا مشورہ سنتا تھا۔ ایسا آدمی فوراً ترکی بہ ترکی جواب کیونکر دیتا۔ جواب کے لئے اسے واقعہ پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ جب اس نے خوب سوچا تو اسے دو بہتر سوجھے۔ بڑے بابو کی ڈھٹائی اور اسی قدر اپنی بھی ۔

لیکن یہ ظاہر ہو گیا تو تم کھلا انہیں مقابلہ کرنا ہو گا۔ اس نے اس قول کو بہت پسند کیا کہ کاروباری معاملوں اور گھریلو باتوں میں ایک گہری ذہنی ایک پختہ حد بندی ہونی چاہیئے۔ بڑے بابو کی کرسی اور چارپائی میں کوئی یکسانیت نہیں ہونی چاہیئے۔ اور بیٹیوں کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے بابو ہونے کا کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اور محض انہیں باپ ہونے کا پاس ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑا بابو دانت پیسنے لگا۔ کیونکہ کسی کا فائدہ یا نقصان کرنا درحقیقت اس کے بس میں نہ تھا۔ اور یہ واقعہ گھریلو کیونکر ہو سکتا تھا جب کہ وہ ضرورت اور خواہش کے باوجود بدلہ نہ لے سکتا تھا۔ اور اس کے منصب کا پردہ چاک ہو جاتا تھا۔

وہ دونوں اصول کے مطابق ایسے رشتے کے خلاف تھے اور معمولی حالات میں ان کا ردِعمل قطعی مختلف ہوتا لیکن انہیں اپنی بیٹیوں کے معاملے سے ہمدردی ہو گئی اور وہ اس لڑکے کو پسند کرنے لگے۔ جس کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ دونوں لڑکیاں اور دونوں باپ اسے حریف سے چھین لینا چاہتے تھے۔

ان دونوں کی خواہش تھی کہ وہ اسے مل کر راضی کر لیں۔

لیکن ہر مرتبہ وہ انتظار کے بعد واپس آ جاتا اور وہ گھر میں نہ ہوتا۔

وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ ایک دوکان کا مالک تھا جہاں وہ چھوٹے بچوں کے لئے سکول کی کتابیں، کاپیاں، چوسنے والی گولیاں، پنسلیں، سلیٹیں اور ربڑ وغیرہ بیچتا تھا۔ عورتوں کے لئے اس نے بالوں کے لئے پلاسٹک کے رنگ برنگے پھولوں والے کلپ اور کنگھیاں اور ایسی اشیاء جمع کر رکھی تھیں۔ وہ دوکان گلی کے ایک تاریک گوشے میں سبزی والے کی دوکان کے ساتھ تھی۔ اور دوکان کا مالک وہیں اکثر سو جاتا تھا کیونکہ گاہک کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کب آ جائے۔

وہ لڑکا جو ایک بیوپاری کا بیٹا تھا۔ ان تمام باتوں سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ منہ میں بیڑی رکھے وہ کسی نئی فلم کا مقبول گیت گنگنایا کرتا۔ اور بیڑی کا دھواں مال گاڑی کے انجن کی طرح بھک بھک منہ سے نکال کر مست نگاہوں سے دیواروں کو دیکھتا تھا۔ وہ ایک لقمہ بھی کھا لے تو اسے ڈکاریں آنے لگتی تھیں۔ اور وہ شرما اس لئے جاتا تھا کہ آواز بہت بیہودہ پیدا ہوتی تھی۔ جو اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنی محبت کے رنگین خواب دیکھتا تھا اور پردہ سیمیں پر اپنے آپ کو پانا چاہتا تھا۔ لوک گیتوں میں مشہور نظمیہ قصوں میں، اخباروں میں گفتگو میں اپنا ذکر چاہتا تھا ۔۔۔ اور وہ لڑکیاں اسی لئے اسے پانا چاہتی تھیں۔

بڑا بابو تجربہ کار تھا اور پلان جلدی بنا لیتا تھا۔ اسے دور کی سوجھی وہ سیدھا دوکاندار کے پاس گیا۔ اس نے قاعدے کے مطابق بات کی۔ اپنی بلند خیالی کا اظہار کر کے معاملہ طے کر لیا۔ اور گھر آ گیا۔ اس نے بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "میں نے بہت سوچا تھا۔ جو ہو گیا اچھا ہو گیا مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

اس کی بیٹی نے مسکرا کر کہا۔ "شکر ہے کہ تم وقت پر سنبھل گئے۔"

وہ شش و پنج میں پڑا اس فقرے کے اشارے کو سمجھنا چاہتا

تھا - اس کی بیٹی کے نتھنے عجیب طرح پھڑپھڑائے تھے - اس نے یہ شکرانہ ادا کرتے وقت اپنے کانوں کا میل ایک دیا سلائی سے پونچھ کر انگلیوں میں رگڑا تھا لیکن اس کی بیٹی کی حرکات اور الفاظ میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی تھی -

پھوٹا بابو سوچتے سوچتے اسی نتیجہ پر پہنچا - اور دوکاندار کے پاس گیا - لیکن وہ صرف مبارک باد کہتے ہوتے تھے دل سے خوفناک مستقبل کو بجلی کی طرح چمکتے دیکھ [illegible] ڈٹ گیا - اس کی بیوی اور اولاد اس کی منتظر تھی - وہ کیا کہتا جو کچھ حقیقت [illegible] تھی، اس نے سنا دی - اس کی لڑکی نے اپنے اوپر کے ہونٹ کو بدبڑ کی طرح کھینچتے ہوئے کہا - "اچھی بات ہے - میں جانتی تھی - وہی ہوگا جو میں جانتی تھی" اور وہ اوپر کے ہونٹ کے بالوں کو پکڑ کر مروڑنے لگی -

"تو کیا جانتی ہے -" اس کے باپ نے بھرائی آواز سے کہا -

"یہ بڑا بابو بہت بے شرم اور بے ایمان ثابت ہوا ہے -"

اور وہ ایک جوان بیٹی کی خودکشی کے تصور سے گھبرا گیا - اس نے کہا — "ہم اور کچھ نہیں کہیں گے نہ سنیں گے - ہمیں بھلا ایسی پرواہ تھی - ہم خاندانی آدمی ہیں - عزت والے ہیں - عقلمند ہیں -"

"میرا فیصلہ اٹل ہے —" لڑکی نے گلوگیر آواز سے کہا - وہ سب غور و خوض خودکشی کے متعلق دھرے رہ گئے - وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ فوراً عمل ہو - اور چھت کافی اونچی تھی - بھاگ کر تیزی سے کودنے میں موت یقینی تھی - وہ بڑھی - اس کی ماں نے چیخ ماری اور بیہوش ہو گئی ——— بچے رونے لگے -

اس کا باپ اچانک طیش میں آگیا - وہ رونا چاہتا تھا لیکن دوڑ کر اس نے بیٹی کو پکڑ لیا - اور پیچھے دھکیلنا چاہا - رات ہو چکی تھی اور

نیچے گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ چھت سپاٹ تھی اور اس کی جوان بیٹی میں طاقت اور بڑش
ن زیادہ تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ بیٹی کو روکتے روکتے کہیں وہ بھی نیچے نہ گر جائے۔
ایک کہرام مچ گیا۔ اس نے آخر لڑکی کو گھونسوں، مکّوں اور تھپڑوں
سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اتنا عرصہ اس کا دل لاوے کو روکے ہوئے تھا۔ اس کی بیٹی
چیختی چلاتی آگے کھسکتی گئی۔ "تم مجھے نہیں روک سکتے۔" وہ چیختی رہی وہ دونوں
کش مکش میں چھت کے آخر تک چلے گئے۔ نیچے گھٹی ہوئی گلی کا گندا فرش تھا۔ ایک
ہلکی سی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اس غل غپاڑے میں اس نے ایک آواز سنی۔ اس کی
بیٹی نے بھی سنی اور وہ دونوں رک گئے۔ اس نے اپنے پر قابو پا کر اطمینان سے
پوچھا۔

"کون ہے۔؟"

"بچاؤ —" اس نے دوکاندار کی دردناک آواز سنی۔ "مجھے
بچاؤ — میرا بیٹا۔" وہاں سے وہ کچھ نہیں سن سکتے تھے۔
فاصلہ بہت تھا۔ لڑکی خودکشی نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ بات
سننا چاہتی تھی۔ وہ نیچے آ گیا۔ اس کی بیٹی اس کے ہمراہ تھی۔
"مجھے بچاؤ —" دوکاندار کانپ رہا تھا۔ "میرا پیسوں
کا ڈبہ نہیں ہے۔ سبزی والے کی لڑکی نہیں ہے۔ میرا بیٹا نہیں ہے۔"
"پولیس —" وہ غرایا۔ اس نے بیٹی کو زور کا دھکا دے کر
دروازہ بند کر دیا اور دوکاندار کو کھینچ کر چل پڑا۔

ننھّے مُنّے

ننھا منا اپنی دھیمی تتلی آواز کی بلند ترین حد تک چیخ چیخ کر اسے پکار رہا تھا۔ دو تین بار میں ہی اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور اسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہاں انتظار کرتے بہت عرصہ بیت چکا ہے گو اتنی دیر ہمیشہ ہی ہوا کرتی تھی لیکن اس روز اس کے ذہنی انتشار نے اسے زیادہ پریشان کر دیا تھا۔

آخر دروازہ کھلا، اس کا ساتھی اور دوست اچھلتے کودتے اسے آملا۔

ننھے منے کی آواز میں، اس کے ماحول میں، اس کے خدوخال میں ایک پختگی اور سنجیدگی تھی۔ یہ پختگی اور سنجیدگی اس نے اپنے والد سے نقل کی تھی۔ وہ دونوں مسکرائے۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں کی جنبشوں سے، تتلی تتلی آوازوں سے، چھوٹے چھوٹے خیالوں سے وہ ایک دوسرے کو مسحور کر لیتے تھے۔ دوستی اور رفاقت کے لئے ان دونوں کی عادتیں اور چاہتیں کافی مناسبت

رکھتی تھیں ۔ مسکرا کر خاموش ، وہ سڑک پر روانہ ہو گئے ۔

اس روز ان کی مسافت ایک خاص منزل تک پہنچنے کے لئے تھی ۔ گو عموماً ان کا خاص پروگرام نہیں ہوا کرتا تھا ۔ وہ دونوں بیکار سڑک پر گھوما کرتے تھے ۔ ان کے گھروں کے بالکل نزدیک ایک شکستہ سٹیج تھا جو جنگ کے دنوں میں فوجوں کے دل بہلا دے کے بعد اب اکثر ویران رہتا تھا ۔ دراصل وہ سٹیج جنگ کی پامال کرنے طاقتوں کا ایک نشان تھا ۔ اس کی ساخت اور موجودہ حالت جنگ کرتی قوموں کی جلد بازی اور ردِ عمل کو ہر وقت ظاہر کیا کرتی ۔ کبھی کبھی اداکاروں کا کوئی گروہ اسے چند لمحے آباد کرنے کی جرات کرتا اور ان کے جانے کے بعد اس کی حالت بدتر ہو جاتی ۔ ایک عجیب مایوسی ، خاموشی ، زمین کے اس تمام حصے کو گھیر لیتی ۔ متاثر ہو کر چند بچے سٹیج پر پہنچ کر ان فن کاروں کی نقل کرتے اور تالیاں بجاتے ۔

ننھا منا ان سب میں فن کے بارے میں زیادہ ہوشیار تھا ۔ وہ ان سب فن کاروں کی نقل زیادہ عقلمندی سے ادا کرتا تھا ، لیکن اس روز وہ اور اس کا ساتھی اس ویران سٹیج پر اپنے فن کو اجاگر نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ وہاں سچے فن کار اپنا کمال پیش کرنے کی تیاریاں کر چکے تھے اور اس شام وہ ہر طرح لیس ہو کر اپنا پروگرام پیش کر رہے تھے ۔ دونوں لڑکے جب نزدیک پہنچے تو شکستہ سٹیج کو ایک بار پھر اسی شان و شوکت سے دمکتا دیکھ کر دنگ رہ گئے ۔ ہر بار اس ٹوٹے پھوٹے تھیٹر میں ناچ کر وہ سوچا کرتے تھے ۔ کتنا بدزیب منظر یکدم ہی وہ ساری خوبصورتی کیونکر بھر لیتا ہے ۔ لیکن اس کا جواب ان کے دماغ نہیں دے سکتے تھے اور راتوں رات اس تبدیلی پر چونک کر انہیں بڑا لطف ملتا کیونکہ زمین کے اس قطع کا ردوبدل مداری کے تماشہ کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مزے دار تھا ۔ وہ ایک طرف خاموش کھڑے ہو گئے ۔ ہر طرف بتیاں روشن تھیں ۔

اور سرخ سفید قنات اور سرخ پردے انہیں دنیا کی رنگینی سے متاثر کر رہے تھے۔ سرخ روش پر موٹریں اور ان کے صاف ستھرے مالک اونچے طبقے کی خواتین ان کے جسموں یا کپڑوں سے نکلتی خوشبوئیں ان کے دماغوں کو تراوت دے رہی تھیں۔ لطیف قہقہے اور مہذب طور طریق ان بازاری لونڈوں کو محض مستی دے سکتے تھے کیونکہ ان کی سمجھ بوجھ پیدائش سے خوابیدہ تھی۔ کاریں مالکوں سے خالی ہوکر ڈرائیوروں کے ساتھ ایک طرف لڑھک جاتیں اور پھر فن کے دوسرے چاہنے والے آموجود ہوتے۔ وہ سب ایک ریلے کی طرح اندر ان قناطوں کے بیچ جمع ہو رہے تھے۔

ننھے منے بچوں کو معلوم نہیں تھا کہ اندر کرسیوں پر بیٹھنے کا کیا راز ہے، وہاں تک پہنچنے کے لئے ٹکٹوں کی ضرورت کیوں ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کئے۔ تجربے سے انہیں معلوم تھا کہ وہ اندر داخل نہ ہوسکیں گے پھر بھی وہ ایک کوشش کرنا چاہتے تھے۔ خاموش وہ آگے بڑھے، چپکے سے انہوں نے اندر جھانکا۔ ان کے اردگرد بےشمار لوگ ایک موج کی طرح اندر جانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس گڑبڑاہٹ میں وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ پھر ایک بار وہ مسکرائے اور خوشی سے اچھلنے لگے۔ ان کے ننگے پاؤں پر جمی مٹی اڑنے لگی۔ وہ ہال میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ان سب کی نظریں بچا کر وہ پچھلی دو کرسیوں پر قابض ہو گئے۔ ان کے دل بلیوں اچھل رہے تھے۔ وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے ــــــ ایک ساتھ ایک زور کا تھپیڑا ان دونوں کے سروں پر دماغ کے عین اوپر پڑا۔ گھوم کر انہوں نے پیچھے دیکھا۔ فن کاروں کے ایک رکن نے آنکھیں نکالیں۔

"چلو، باہر نکلو، اٹھو!"

اس کی سخت آواز ان کے کانوں سے ہوتی ہوئی ان کے سارے جسموں پر رینگ گئی۔ ان کے دل اسی طرح اچھلتے رہے، گو اس میں کافی فرق آگیا تھا۔

"اٹھو ـــــ" فن کار نے چیخ کر کہا۔

سہمے سہمے وہ اٹھ بیٹھے۔ ملزمانہ نگاہوں سے انہوں نے اس غصّے اور آگ کے بگولے کو دیکھا جو انہیں گھور رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھے۔ ایک اور شخص آپہنچا۔ "کیا پتہ بھئی، یہ کسی کے ساتھ ہوں پوچھ لو۔"

فن کار نے سختی سے کہا ـــــ "تمہارے پاس ٹکٹ ہیں۔"

وہ دونوں رک گئے۔ ڈر کر انہوں نے نفی میں سر ہلا دیئے۔

"بھاگ جاؤ ـــ" دوسرے نے ہنس کر کہا۔

"بھئی یہ لونڈے بڑے بدمعاش ہیں ـــ" فن کار نے کہا۔

وہ قناط سے باہر واپس سرخ راہ پر پہنچ چکے تھے۔ پھر وہ شخص ہنسا۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ تو وہ ہنس سکتا تھا!

باہر پہنچ کر انہوں نے کھلی ہوا میں ایک بار دل بھر کر سانس لیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ کاریں اور انسان اسی طرح بے تحاشہ آرہے تھے۔ اس لگاتار تانتے میں وہ ہر ایک کا منہ دیکھتے اور ٹھوکریں کھاتے رہے۔ انہیں اور کئی بچے قناط کے باہر ایک طرف سوراخوں میں سے جھانکتے نظر آئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ پھر وہ دوڑ کر ان تماشائیوں میں شامل ہو گئے۔ اپنی جنس کو پاکر اپنے ہمجولیوں میں پہنچ کر ان کے ذہن ایک بار پھر کھل اٹھے۔ ان کی تازگی لوٹ آئی۔ ایک تھپڑ کی یاد معدوم ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ سب سے آگے سوراخوں میں سے جھانکنے کے لئے الجھنے لگے۔ ۵۵

سب ہنس کھیل کر اندر داخل ہو کر اور سیٹوں پر بیٹھے لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

ان کے نزدیک وہ سب تماشا تھا۔ اداکاروں کے فن اور کمال کے برابر۔ ان لوگوں کا وہاں آنا، اندر داخل ہونا، ان کی کاروں کا ایک طرف لڑھک جانا، پیدل تماشائیوں کے چہروں کی سختی اور ان کی چال اور گفتگو کی ہچکچاہٹ، وہ سب کچھ تماشا تھا۔ بلکہ وہ پردے یا کرسیاں یا اسٹیج کی شان و شوکت بھی ایک تماشا تھا۔ اور وہ اسے پورے لطف اور تسلی سے دیکھ رہے تھے، وہ خوشی سے اچھل رہے تھے، کود کود کر ہنس رہے تھے، دھکیل پیل کر سوراخوں میں سے جھانک رہے تھے۔ چیخ چیخ کر دوستوں کو بلا رہے تھے۔ اس تمام شور و غوغا میں وہ اس تماشے کو بھی بھول گئے تھے۔ وہ اپنے دل کی مسرّت اور پر لطف دھڑکن میں سما گئے تھے۔ انہیں کہیں کا کسی کا، کچھ بھی ہوش نہ تھا۔

"اوئے۔" ایک گرج ہوئی۔ ایک چیخ پھیلی اور سنّاٹا چھا گیا۔

اپنے کو سنبھال کر انہوں نے دیکھا۔ ایک پولیس کا سپاہی ان کی طرف آ رہا تھا۔ وہ سب وہاں سے بھاگ گئے۔ سڑک کے پار بنگلوں اور مکانوں کے پیچھے، تھیٹر کی فضا سے کھو کر ——— تھوڑی دیر تک کوئی واپس لوٹنے پر تیّار نہ ہوا۔ سب سے زیادہ ڈر اس پولیس کے سپاہی کا تھا۔ ورنہ فن کاروں کے تھپڑوں یا غصّہ کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

دونوں ننھے منے دوسرے ساتھیوں سے جدا ہو گئے۔ تھیٹر کے بالکل نزدیک ان کے گھر تھے۔ وہ دونوں اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔ راستے میں وہ اپنے خیالوں اور تاثرات پر مباحثہ کرتے رہے۔ دو تین منٹوں میں وہ

اپنے گھروں کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ والدین ان کے بھائیوں بہنوں کے ساتھ باہر جا رہے تھے۔

"کہاں۔؟" انہوں نے پوچھا۔

"تماشہ دیکھنے ــــ" ایک بار پھر وہ پھولے نہ سمائے۔ ان کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اچھلتے کودتے وہ اپنے رشتہ داروں کے جلوس کے آگے چلتے رہے وہ اپنے گھر والوں کو اپنی قیمتی رائے اور مشوروں سے آگاہ کرتے رہے۔ کیونکہ انہوں نے سب کچھ پہلے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سب کچھ بتا دیا۔

"ٹکٹ ہیں تمہارے پاس۔" ننھے نے سوال کیا۔

اسے کسی نے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ سوال کرتا رہا۔ آخر جب وہ نزدیک ایک باورچی خانے کی چھت پر بیٹھ گئے اور سامنے تھیٹر کے سرخ پردے، قناطوں کے اندر کرسیوں پر بیٹھے لوگ اور آتی ہوئی خلقت کا تماشا اور ایک طرف جمع ہوتی موٹروں کی صفیں۔ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ پھر اس کے سوال کا حل مل گیا۔ خوشی سے ایک بار پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

باورچی خانہ بھی فوجوں کی خاطر دورانِ جنگ میں جلد بازی سے بنایا گیا تھا تاکہ کھیل تماشے دیکھنے میں مشغول فوجی کھانوں سے سیر ہو سکیں وہ وہاں بیٹھے رہے۔ اپنے بہنوں بھائیوں اور بڑوں کے ساتھ مل کر انہوں نے چیخ چیخ کر سوال شروع کر دیئے۔ آتے جاتے لوگوں پر تنقید ان کی خواتین کے لبادوں کی تعریفیں ان کے بزرگ کر رہے تھے اور وہ محض خوشی میں سرشار اپنے احساسات کو اچھل کود کر اور چیخ کر بیان کر رہے تھے۔ دفعتاً پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔ انہوں نے جھانک کر دیکھا۔ پروگرام کا منیجر اور پولیس کے سپاہی اونچی

آوازوں میں انہیں مخاطب کر رہے تھے۔

"نیچے اتر دو ــــ وہ جگہ تمہارے لئے نہیں تھی ......"

غصے، جوش اور جھڑکیوں کے درمیان وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ننھے منوں نے دیکھا کہ ان کے گھر والے اس واقعہ کو مسکراہٹ اور معمولی حیثیت دیکر ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر شرمندگی کو محسوس کرنے کی خواہش تھی۔ بے سروکاری سے اٹھ کر وہ نیچے اتر آئے اور سیر کرنے کے لئے چلے گئے۔ ننھے منے وہیں اس سرخ راہ پر رہ گئے۔ اس وقت تک ان کے چھوٹے چھوٹے دماغوں میں ایک حیرت اور اس تمام واقعے کی ایک ہلکی سی اہمیت اثر کر چکی تھی۔ انہیں اداکاروں کے اس گروہ کے بارے میں عزت اور رعب محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اتنے لوگوں کو اس وقت تک تیزی سے آتے دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے تھے۔

ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ رنگ برنگی بتیاں سٹیج پر پڑے پردے کو جھلملا رہی تھیں۔ اگلی گدے دار کرسیوں پر بیٹھے مردوں کے چہروں کی سنجیدگی اور عورتوں کی ہلکی مسکراہٹ، ان کے نفیس لباس ...... ان کے بعد اوسط طبقے کے افراد کی غمناک اور مایوس نگاہیں۔ ان کی بیویوں کی احمقانہ حرکات، ان کے بوسیدہ اور بے رنگ کپڑے، ان کے بچوں کی چپچپی جلدیں ...... اور آخر غریب یا اوسط طبقے کی سب سے کم درجہ خلقت، گندگی اور بو کے سیاہ اور بے ربط دھبے ...... یہ دنیا ایک تھیٹر دیکھنے آئی تھی۔ یہ دنیا اپنے مخصوص طریقے کے مطابق قطاروں کے اندر صفیں بنا کر بیٹھی تھی۔ فن کار کو سٹیج پر دور پیچھے یا سب سے آگے ہر کوئی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن جس طرح انہوں نے خلقت کو ہال میں بانٹا تھا، یہ ان کی چالاکی یا دل کی نفاست تھی۔ یہ بات ہر ایک کے مطالعہ کے لئے

کھلی تھی کہ وہ گندگی سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ کتنی دور تھے۔ وہ کتنے صاف ستھرے اور
اونچے درجے کے اداکار تھے ـــــ ہال کا پردہ اٹھنے کی انتظار میں تڑپ رہا تھا۔
جو ابھی باہر ٹکٹ لے رہے تھے یا داخل ہونے کے لئے خاموش قطار میں کھڑے تھے،
وہ پردہ اٹھنے کے مخالف تھے۔ جوں جوں وہ کرسیوں تک پہنچ جاتے ان کے دل بھی
پردے کی ذرا سی حرکت پر اچھلنے لگتے۔ وہ بھی چاہتے کہ اب پروگرام شروع ہو جائے
وہ حیران ہوتے کہ دیر کس بات کی رہ گئی تھی۔

چنانچہ دونوں ننھے منے سپر سوراخوں سے جھانک کر حیران ہو رہے تھے
کہ بھلا کیا ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ ان کے تقریباً
سب ہجولی موجود تھے۔ لیکن اس بار وہ اتنی شوخی سے پیش نہیں آئے۔ وہ وہاں رہنا
چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پولیس کے سپاہی یا اداکاروں کے افراد انہیں باہر
نہ دھکیل دیں۔ اسی لئے۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ اور بھیڑ کے بڑھنے
کی وجہ سے ہی شاید کسی نے پھر انہیں کچھ نہ کہا۔

انہوں نے چھ گوٹیاں اور کانا پوسیاں سنیں۔ تھوڑی دیر میں ایک
خوبصورت کار رقناطور کے نزدیک آکر رکی۔ ایک بارعب سنجیدہ اور خوش لباس
آدمی اترا۔ بیسیوں لوگ استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ اسے دعوت نامہ دکھانے
کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اور ہاتھوں ہاتھ اسے سب سے آگے صوفے پر پہنچا دیا گیا۔
یکدم روشنی گم ہو گئی۔ یکدم پردہ اٹھا اور پروگرام شروع ہو گیا۔ جھنڈا لہراتی
کار بھی دوسری کاڑیوں کی طرح ایک طرف لڑھک گئی۔

انہوں نے کار کا اچھی طرح مطالعہ کیا۔ انہوں نے اس کے گرد چکر
کاٹے۔ وہ اس کے رعب اور دبدبے سے بے حد متاثر ہوئے۔ پھر ایک پولیس کا سپاہی
آیا۔ اس نے ان کے کان پکڑ کر انہیں احاطے سے باہر نکال دیا۔ اپنے کانوں کو

ملتے وہ دونوں دوست دور سے دیکھتے رہے۔ وہ سپاہی وہیں تنا کھڑا تھا۔ اب انہیں جرات نہ ہوئی ورنہ وہ سوراخوں میں سے ہی سہی، اصل تماشے کا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔

وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ آسمان پر سیاہی چھا گئی تھی۔ سٹیج کی روشنی آسمان اور زمین کے درمیان ہواؤں میں سفیدی پھیلا رہی تھی۔ سازوں اور موسیقاروں کی آوازیں فضا میں تیر رہی تھیں۔ لطف اندوز ہجوم کی تالیاں اور پھر سازوں کی جھنکار ایک مسلسل طریقے سے بجتی رہیں۔ وہ دونوں بازاری، بیکار بے حس چھوکرے رات کی سیاہی میں ملفوف سڑک کے کنارے کھڑے ان کاروں کو گنتے رہے۔ پولیس کے سپاہی کسی حرکتوں کو دیکھتے رہے۔ باہر آکر چائے وغیرہ نوش کرتے ٹکٹ والوں کو دیکھتے رہے۔ وہ ہال میں بسی ہوئی بھنبھناہٹ سنتے رہے لیکن اس سوراخ کے پاس جاکر کھڑے نہ ہو سکے۔ ان سب سے زیادہ موٹر جھنڈے والی موٹر کا ڈرائیور تھا جو ٹوپی ہاتھ میں لئے قناط کے دروازے کے اندر کھڑا تھا۔ اور بے ٹکٹ کھلم کھلا اس اہم اور قیمتی فن کو مفت آرام سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں دور کھڑے ان سب کو بے فایدہ گھور رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد جھنڈے کی موٹر کا مالک اندر سے آگیا۔ آگے بڑھ کر ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ دو تین شخص اسے کار میں بٹھانے کے لئے آپہنچے۔ ہاتھ جوڑے وہ کار کے چلے جانے تک وہیں کھڑے رہے۔ پھر اس باحیثیت تماشائی کے وقار اور عزت بخشی پر حیران اور متعجب وہ مسکرانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب سحر ٹوٹا اور انہیں احساس ہوا کہ کار غایب ہو چکی تھی تو وہ زیرِ لب باتیں کرتے واپس لوٹ گئے۔ کھیل ختم ہونے تک وہ خوبصورت صوفا اگلی قطار میں خالی پڑا رہا۔

آخر اداکاروں نے سٹیج پر پردہ گرا لیا۔ تالیاں گونجیں، لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے ٹکٹوں کی قیمت وصول ہو گئی ہے۔ ہنستے کھلکھلاتے لوگ دوبارہ کاروں تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ دونوں بچے ایک طرف سنجیدگی سے کھڑے رہے۔ اتنی دیر کے سکوت کے بعد وہ غل غپاڑہ انہیں بھلا معلوم ہوا۔ انہیں تماشائیوں کے مطمئن چہروں کو دیکھ کر ان کے زرق برق لباس دیکھ کر لطف آگیا۔ سپاہی اتنی دیر تک تھکا ہارا چلا گیا تھا۔ اب اس کپڑے کی دیوار کے اندر جھانکنے میں انہیں کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔۔۔۔ وہ جی بھر کر اندر جھانک سکتے تھے۔ انہیں سوراخوں میں سے وہ اندر کا نظارہ دیکھنے لگے۔ پردہ پہلے کی طرح ساکت تھا۔ روشنی نسبتاً کم ہو گئی تھی اور ہال خالی ہو رہا تھا۔ پھر وہ راہ ڈھونڈتی موٹروں کا تماشا دیکھنے لگے۔ اندر سٹیج کے اردگرد انہیں ایک خوف کا احساس ہوا۔ ایک ٹھہرا ہوا ماحول آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں گم ہوتی روشنی میں ہر طرف دکھائی دیا۔ رفتہ رفتہ خلقت وہاں سے چلی گئی۔ گھروں میں، کلبوں یا ہوٹلوں میں، جہاں جھنڈے والی موٹر کا مالک ان سب سے پہلے پہنچ چکا تھا۔

یہاں خاموشی چھا گئی تھی۔

بچے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ پھر انہوں نے اندر جھانکا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے وہ اندر داخل ہوئے۔ وہ جو اس تمام کھیل اور اس کے پرجوش اثرات کے شائق تھے۔ خالی ہال میں اپنے آپ کو پاکر جھوم اٹھے۔ وہ ہر کرسی پر بیٹھ کر اپنی حسرت مٹانے لگے۔ وہ ہر قطار سے مختلف زاویوں سے سٹیج کو پاکر بھی سیر نہ ہوئے۔ انہیں اس کھیل کو دیکھنے اور فن کا احترام کرنے کا کتنا جوش تھا۔ سیٹوں کے نیچے ادھ جلے، تھوکے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑوں اور ڈبوں کو اکٹھا کرتے کرتے وہ آگے تک پہنچ گئے۔ وہ چہکنے لگے۔ وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے

سے باتیں کرنے لگے۔ وہ اس مسرت میں کھو گئے۔ وہ اس خوبصورت پر وقار عزت آمیز صوفہ پر بیٹھ کر مالِ غنیمت بانٹنے لگے۔

سرخ سرخ آنکھوں نے گھور کر انہیں دیکھا۔ اس نے ان دونوں کے کان پکڑ لئے۔ ایک سنسنی ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر اس نے ان دونوں کو ایک ساتھ زور سے تھپڑ مارا۔ ایک لمحہ وہ ڈبے، چاندی کے ورق اور سگریٹوں کے ٹکڑے بھول گئے۔ پھر انہوں نے جلدی سے سب کچھ سمیٹا۔ وہ فن کار کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے نہیں سنا۔ دوڑ کر وہ اس دہشت انگیز دائرے سے نکل بھاگے۔

ننھے منے کے گال میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ اس کا رخ پھڑک رہا تھا۔ کانوں کی سائیں سائیں میں ایک سوال پیدا ہونے لگتا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اس سوال کو نہ سمجھ سکا۔ اپنے بوسیدہ چیتھڑوں میں اس نے ڈبے چھپا لئے۔

وہ سوال سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ ابھی وہ بہت چھوٹا تھا۔

سستے داموں پر

اس نے ماچس دکھلا کر دو چار لمبے لمبے کش لئے۔ اگر رات کی سیاہی ہوتی تو وہ ننھا سا شعلہ زیادہ چمک اٹھتا لیکن شام کی شکستہ شعاعوں میں صرف منہ میں سے نکلتا دھواں اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ سگریٹ جلنے لگی ہے۔

وہ شام کے وقت ہمیشہ اس سڑک پر گھومنے کے لئے چلا آتا تھا۔ سبھی دھجی دوکانوں کی تیز روشنیوں میں خوبصورت ملبوسات میں چھپے کتنے مجسمے کسی درخت کی شاخوں اور پتیوں کی طرح اِدھر اُدھر ہلنے جلنے لگتے تھے۔ ایک بندھے ہوئے اصول کی طرح وہ خاموش، پٹڑیوں پر آہستہ آہستہ چلتا جاتا۔ اس کی آنکھیں بڑے اطمینان سے سب کو دیکھتی ہوئی آگے پھسلتی جاتیں لیکن اسے ان سب سے کوئی تعلق براہِ راست نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ دوکانوں میں جاتے اور آتے لوگوں کو خرید و فروخت کرتے دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔

ان دوکانوں میں داخل ہونے کا خیال آہستہ آہستہ اس کیلئے

ایک واہمہ سا بن گیا تھا۔ اسے وہاں جاتے ہوئے ایک ڈر یا خجالت کا احساس بری طرح ہونے لگتا اور وہ ضرورت ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ کترانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنی حیثیت سوسائیٹی میں بہت کم درجہ سمجھتا تھا کیونکہ وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ اس کی جیب میں اتنے پیسے کبھی نہ ہوئے تھے کہ وہ بے جھجک جتنا چاہتا خرید سکتا۔ ویسے بھی اسے ایک گمان پیدا ہوگیا تھا کہ وہ ان خوش پوش انسانوں کے قریب جانے کے قابل نہیں جو ان دوکانوں میں ہر وقت بھیڑ کئے رہتے تھے۔ لیکن اسے کبھی اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ وہ سیر کرتے وقت ان لوگوں کے پاس سے گزر جاتا تھا۔ اگر اسے کبھی معلوم ہو سکتا کہ اس کا لباس کتنا بدزیب یا ان کے مقابلہ میں انتہائی بے قدر ہے تو وہ شاید اتنی بے باکی کے ساتھ سیر بھی نہ کر سکتا۔ اور یہ وہم اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ وہ ان کے جنگل سے نکلنے کے بالکل نااہل ہو چکا تھا۔ اور اپنے اس معیار میں ایک تسکین پانے لگا تھا کبھی جب اسے اپنی حالت کی اصلیت محسوس ہونے لگتی تو وہ اس تکلیف سے بچنے کے لئے خاموشی سے حقیقت کو نظرانداز کر جاتا۔ پھر اسے اطمینان ہو جاتا۔ بڑے مزے سے لوگوں کو دیکھتا ہوا وہ آگے بڑھ جاتا۔

یہ وقت ستانے کا تھا۔ اپنی سخت سخت انگلیوں میں سگریٹ کے ٹکڑے کو اس نے بری طرح دبوچ رکھا تھا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں چند عورتوں مردوں کو کسی کار میں سے باہر نکلتے یا اندر بیٹھے دیکھتیں۔ وہ انہیں بہت بلند سمجھتا تھا۔ جانے، ان کی زندگی کیسی تھی۔ پھر حقیقت اس کے سامنے سطح سے اونچا اٹھنے لگی لیکن یہ وقت ستانے کا تھا۔ اس وقت وہ سگریٹ کا دھواں چاٹنا چاہتا تھا جو چند سکنڈ اس کے پھیپھڑوں میں بند رہ کر کھر ہوا میں بکھر جاتا ہلکی ہلکی باند کتنی کتنی دور تک پھیل جاتی۔ کوئی پرمزہ گار بے فکری میں سانس

لیتے لیتے یکدم چونک پڑیگا۔ کیونکہ شہر میں رہتے رہتے سگریٹ کی بو سے وہ واقف ہو چکا ہے اور یکدم اس کی حس پہچان لیتی ہے۔ پھر بندھے ہوئے قوانین......! وہ تھوک دیتا ہے۔

فوراً اس نے اپنے ایک دوست کو پہچان لیا۔ "کہاں جا رہے ہو۔" اس نے جلدی سے سوال کیا۔

"یونہی ذرا ضروری کام ہے یار۔" دوست جلدی میں تھا۔ اس کی آواز میں پریشانی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گیا۔

اس اچانک ملاقات کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اسی طرح خاموش آگے بڑھتا گیا۔ اس کے سامنے تھوڑی دور پر سینما تھا۔ جہاں کتنے لوگ ہر وقت جمع رہتے تھے۔ وہ فلم دیکھنے کا شوقین تھا لیکن پھر اس کی جیب کا سوال پیدا ہو جاتا۔ ہر فلم دیکھنے کی اس میں جرأت ہی نہ تھی۔ اس نے وہ فلم دیکھے تھے جن کے بارے میں اس نے بہت شہرت سنی تھی۔ وہ اگر عام لوگوں کی طرح سستے ٹکٹ خریدنا چاہتا اور بے فکر ہو کر اگلی قطاروں میں بیٹھنا پسند کرتا تو وہ ہر پکچر بڑی آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں عجیب شرم کا احساس آدبوچتا۔ کم از کم ایسے موقعوں پر وہ ان امیر لوگوں کی نظروں میں ایک حقیر آدمی نہیں بننا چاہتا تھا۔ جانے اسے یہ کیوں محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایک اہم فرد ہے جسے سب جانتے ہیں اور ایک معمولی سیٹ پر بیٹھ کر فلم دیکھنے کے بعد جیسے سب اسے ہمیشہ پہچان لیا کریں گے۔ جیسے ان کی انگلیاں اسی کے سینے میں چبھنے لگیں گی۔ "یہی ہے وہ ــــــ" اس نے سینما دیکھنا ہی تقریباً چھوڑ دیا تھا۔

سینما ہاؤس کے سامنے گزرتے وقت اسے اپنا وہی دوست ٹکٹ

خریداروں کی قطار میں کھڑا نظر آیا- وہ اتنی جلدی میں اسی لئے تھا اور اسے دیکھ کر قدرے بوکھلا گیا تھا ——— ایک بار پھر اس کے دل میں پکچر دیکھنے کا شوق ابھرا- لیکن وہ ایسی فضول خرچی نہیں کرنا چاہتا تھا- یا وہ ایسی فضول خرچی کے قابل ہی نہ تھا-

یہ سکے کتنے پاک تھے جنہیں وہ جیب میں سنبھال کر رکھنا زیادہ پسند کرتا تھا- محض ان کی آواز اسے مسرور کرنے کے لئے کافی تھی-

اس کا دوست ٹکٹ لے کر پان والے کی دوکان کی طرف جا رہا تھا- ایک سگریٹ اور ایک پان پکچر دیکھتے ہوئے تفریحی طور پر کافی تھا- خود اس کا دل ایسی تفریح کرنے کو چاہ رہا تھا- اس کے پاؤں سینما کے سامنے جا کر رک گئے- وہ باہر لگی تصویروں میں فلم کی دلچسپی ڈھونڈنے لگا-

"پکچر دیکھنے آئے ہو-" ہاتھوں کو دیوار سے رگڑتے ہوئے اس کے دوست نے قریب آکر پوچھا-

"نہیں تو ——— آج نہیں-" اس نے ٹالنا چاہا- "تم فلم دیکھنے آئے ہو-"

"میں نے کسی کو وقت دیا تھا-" اس نے بات بنانا چاہی- "میرے ایک دوست نے فلم دکھانے کی دعوت دی ہے دراصل-"

اپنی آنکھوں سے اسے خود اپنا ٹکٹ لیتے اس نے دیکھا تھا- لیکن وہ خاموش رہا-

اس کے دوست نے سگریٹ شاید اسی لئے نہ سلگائی ہو کہ پھر اسے بھی پوچھنا پڑیگا-

"پکچر اچھا ہے-" اس نے اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح دیکھتے ہوئے

کیا۔ پان کا رنگ دیوار سے رگڑ کر صاف ہو چکا تھا جس کی جگہ دیوار کی سفیدی لگ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ قمیص سے رگڑ لئے۔ باقی ماندہ گندگی جسم سے نزدیک تر ہو گئی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے دوست نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ "ایک ٹکٹ خرید لینا۔ میں تمہارے لئے جگہ اپنے نزدیک ہی رکھوں گا۔"

"نہیں نہیں۔" اس نے ہڑبڑا کر کہا۔ "پھر کبھی سہی۔ پھر کبھی۔"

وہ واپس گھر کی طرف چل دیا۔ اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ اپنی ایسی حالت سے خود وہ اکتا گیا تھا۔ آخر اس کا دل زندگی کے ان سب حسین خوابوں سے متاثر تھا۔ ایک عجیب امید ہمیشہ ایسے اوقات میں پختہ ہو جاتی ہے جیسے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ وہ بہتر معیار اور فارغ البالی جس کے لئے وہ اکثر سوچا کرتا ہے۔ جلد ہی آنے والی ہے۔ یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ وہ کتنی دیر سے اسی امید پر نظریں گاڑے بیٹھا ہے۔ ہمیشہ وہ حالت نزدیک تر محسوس ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر وقت کا پاس نہیں ہوتا یا وہ خود اس بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا کہ یہ امید کتنی بے پایہ ہے۔ اگر کبھی اس بات کا احساس ہو بھی جائے تو وہ خدا اور گناہ کے حکم میں گھوم جاتا۔ پھر ذہن باغی ہو کر دوسرے لوگوں سے اپنا مقابلہ کرنا چاہتا تو یقین کر لیتا اس کے معیار سے بلند اور کوئی درجہ ہی نہیں۔ وہ سب باتیں جو اس نے کتابوں میں پڑھی ہیں یا سنی ہیں محض لغو اور بکواس ہیں۔ اس طرح اسے ایک گونہ تسکین ہو جاتی لیکن شاندار ہوٹل ہمیشہ لوگوں سے بھرے اور سینما کی قیمتی ٹکٹیں بھی ہر روز بک جاتیں یا خوبصورت موٹریں وہ خود سڑکوں پر دوڑتے دیکھ رہا تھا۔ بس صرف وہی غریب تھا۔ وہ خود بے بس تھا ورنہ دنیا تو بڑے مزے سے وقت گزار رہی تھی۔ اس بات کا کوئی جواب نہ تھا کہ آخر وہ کیوں اس حیثیت کو نہیں پا سکتا —— خالی خولی باتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو

وہ تھا، سو تھا وہ حقیقت کو چھپا نہ سکا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کتنی بار اس کی بے بسی اسے پریشان کر دیتی۔ لیکن ہمیشہ وہ اسے ایک نئی بات سمجھنے لگتا۔ وہ ایک ہی طرح کڑھتا، ایک سے ہی خیال ہمیشہ اس کے دماغ میں آتے۔ وہ اپنے آپ کو پھر سمجھانے لگتا۔ وہ جان بوجھ کر ٹال رہا ہے۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو کیا کر نہیں سکتا۔ محض اس نے اپنے آپ کو روکا ہے۔

بہت دیر تک یہی وہم نہیں چل سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی اتنی حیثیت نہ تھی۔ کہ وہ لطف کی خاطر کوئی کام کر سکتا۔ ہوٹل میں جانے یا پکچر دیکھنے کی اس میں جرأت ہی نہ تھی۔

جب وہ گھر پہنچا تو وہ قدرے خاموش تھا۔ خود اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گلا بھر آگیا ہے اور وہ بول نہیں سکتا۔ اس کی بیوی کھانا تیار کر چکی تھی۔ اس نے محض دل بہلاوے کے لئے پاس پڑی کرسی کو ہلانا شروع کر دیا۔ دراصل اسے بھوک بھی نہ تھی۔ وہ چڑ گیا تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں ان مہنگے ہوٹلوں میں جا کر کھانا کھا سکتا۔ اس کی بیوی اور وہ دونوں ایک ایسے ہوٹل میں جا کر قیمتی غذاؤں سے پیٹ بھر سکتے ہیں۔ بیرا صاف کپڑے پہنے ان کے ہر حکم کی تعمیل سر جھکائے کریگا۔ اس وقت وہ جان بوجھ کر اس حسین نغمہ کو نہیں سنے گا کیونکہ وہ اپنی بیوی سے باتیں کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ اس طرح لوگ انہیں غور سے دیکھیں گے۔ ان کی دلچسپ مسکراہٹیں ان سب کے دلوں میں حسد پیدا کر دیں گی۔ وہ اطمینان سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پکچر دیکھنے کے لئے سب سے آخری پچھلی لائین میں سیٹوں پر بیٹھ جائیں گے۔ وہ سینما ہال میں اس وقت پہنچیں گے جب بتیاں بجھ چکی ہوں گی۔ اس طرح بھی ان کی شخصیت سے لوگ مانوس ہو سکیں گے ——— لیکن اس کی بیوی اس کے سامنے کھانا رکھ چکی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ لقمہ منہ میں ڈال رہا تھا۔ وہ جانتا تھا۔

ریستوران کی لطیف خوشبو اس وقت اس کے نتھنوں میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اور اس کی بیوی کسی پکچر کا پروگرام نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی بیوی کو بالکل پچھلی قطاروں میں بٹھانے کے قابل نہ تھا، کم از کم فی الحال۔

کھانا ختم کر کے اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ یہ سب کچھ کتنی بار اس کے ساتھ ہو چکا تھا لیکن وہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کس طرح ان پابندیوں میں تسکین پالے۔ بار بار اس کا دل بے قابو ہو جاتا۔ اس نے ایک دو بار یہ بھی چاہا وہ اسی وقت جا کر دو ٹکٹیں اونچے درجے کی خرید لائے اور پکچر دیکھ لے لیکن یہ بچپنا تھا۔ یا اس کے دماغ کا قصور تھا۔ مغموم ہو کر وہ چپکے سے لحاف میں چھپ گیا۔ خود بخود اس کے دل میں ایک سکون پذیر جذبہ پیدا ہونے لگا جیسے کوئی ذہنی تکلیف نہ تھی۔ پھر بھی باوجود کوشش کے وہ دوبارہ اس جوش کو محسوس نہ کر سکا یا ان ولولوں پر جھنجلا نہ سکا۔ بڑے اطمینان سے وہ لیٹ رہا۔ اس کا دماغ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ اپنی کم حیثیت زندگی میں وہ کس طرح کسی بات میں لطف اٹھائے گو کوئی تجویز فراہم نہ ہوتی تھی۔

کمرے میں روشنی کم ہو گئی۔ کیونکہ سارا کام ختم کر کے اس کی بیوی آچکی تھی۔ اس نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ تھوڑی دیر وہ باتیں کریں گے۔ جن میں کوئی دلچسپی ضرور ہو گی۔ پھر ان کی آنکھیں غنودگی سے بھر کر گھٹنے لگیں گی۔ اور وہ سو جائیں گے۔

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگے۔ وہ اس میں لطف محسوس کرنے لگا۔ ایک برتری کا احساس اس میں کوند گیا۔ اس لمحہ وہ غریب نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ ایک اونچے معیار کا انسان بن جاتا۔ یہی لمحہ ذہنی کشمکش پر فراغت کا باعث تھا۔ اس لمحہ اس کی جیب محفوظ تھی۔ اس نے اسے

اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس وقت ایک نئی فضا تعمیر ہوتی محسوس ہوئی
ایک بار پھر وہ بھول جاتا کہ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح
ہمیشہ اسے اپنی محدود دلچسپیوں کا حل مل جاتا ہے۔

× × × ×

× × × ×

رفتہ رفتہ اس کی امنگیں اپنے محور کے گرد لپٹ کر رہ جانے لگیں
اور وہ محسوس کرنے لگا کہ واقعی اس کی حالت سے بہتر کوئی درجہ ہے ہی نہیں۔ محض
خوابوں یا خیالوں کو عملی جامہ پہنتے سوچنا کافی نہیں۔ اسے ایسا لگنے لگا کہ وہ حقیقت
سے کوسوں دور ہے ——— ہر روز نئے تجربوں کی وجہ سے اپنی ذہنی حیثیت
اونچی اور بدرجہ بہتر نظر آنے لگتی ہے تو پھر وہی معیار بھی بن جاتا ہے۔ اور
اس سے اوپر خلا ہی محسوس ہوتا ہے۔
اور وہ پھر بھول جاتا کہ وہ نئے طور پر تسکین پانے کی کوشش کرتا
ہے۔ بہرحال اس کی عادتیں یا اس کے خیال اس کی مادی حیثیت کے برابر
ہو گئے اور یہ وہ نقطہ ہے جہاں سکون مل جاتا ہے اور لامحدودیت کا خیال
اذیت نہیں دے سکتا۔ وہ چلتے واقعات میں کھو رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے دل
میں پرانا جذبہ اکساتا ۔ خوبصورت موٹروں یا خوشگوار اوقات اسے اپنی طرف
متوجہ کرتے تو تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ اس کے دل میں یہ جذبہ حسد کی جگہ سکون
تلاش کر لیتا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑاتا آگے بڑھ جاتا۔
اس کی پوری پوری امید بندھ جاتی۔ وہ بھی کبھی ایسی موٹروں میں

بسر ضرور کریگا۔ وہ بھی انہیں لوگوں کی طرح بے فکر ہو سکے گا۔ ابھی تو کافی وقت باقی تھا ــــ سگریٹ کا ایک کش، یا اپنے دو بچّوں کی ہاتھا پائی، یا بیوی کے جسم کی لطافتوں میں کھو کر وہ پھر اسی راہ پر چلنے لگتا۔ یہ روکاوٹیں خود بخود ایک طرف کھسک جاتیں وہ محسوس کر لیتا وہ پورا لطف اٹھا رہا ہے۔ باقی پھر سہی، پھر کبھی......

اس کے کھانے کی میز کے ارد گرد چار کرسیاں تھیں۔ کھانا کھاتے وقت وہ چاروں اکٹھا بیٹھ کر بے معنی باتیں کرتے رہتے۔ اپنے بچوں کو بھی وہ بہت ذہین اور غیر معمولی سمجھتا تھا۔ ان کی ہنسی، ان کا مذاق، ان کی ایک ایک حرکت بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ " اس کے "بچے تھے۔ اور" اس کے" بچے قدرت نے اپنے پاک ہاتھوں سے خود گھڑے تھے۔ ان کی روحوں کو خود خدا نے پاک کیا تھا۔ ان کے دماغ سرسوتی نے بخشے تھے۔ ان کا مستقبل لکشمی کے سپرد تھا ہی۔ اس کے بچے بلا کے ذہین اور خوبصورت تھے۔ کیونکہ وہ اس کے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اس کے نہ ہوتے تو ان میں کتنی کمزوریاں کتنی حماقتیں ہوتیں لیکن ان میں کوئی نقص نہ تھا کیونکہ اس کی بیوی نے انہیں جنا تھا۔ اور اس کی بیوی۔

بیوی اسے بہت پسند تھی۔ وہ اس کی لطافتوں اور خوشیوں کی اکیلی ذمہ دار تھی۔ بیوی کا کوئی براہِ راست تعلق تو نہیں ہوتا۔ خون یا نسب کی ملاوٹ کوئی نہیں ہوتی لیکن اس میں ایک عجیب کشش تھی۔ اگر وہ سمجھنے کی کوشش بھی کرتا تو یہ اس کی سمجھ سے بہت بلند چیز تھی۔ کہ بغیر کسی رشتے کے وہ اسے اتنی پسند کیوں تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی میں کشش ہے۔ وہ اسے پسند ہے اور وجوہات سے وہ ہمیشہ دریغ کرتا ہے۔

وہ زرد زرد رہتی تھی۔ وہ جب دوسری سرخ و سفید عورتوں کو دیکھتا

تو اس کا دل بری طرح چاہتا، اس کی بیوی بھی ان جیسی خوبصورت ہو۔ چنانچہ وہ بے سوچے بازار میں چلا گیا۔ دو کانوں کے آگے چلتے چلتے وہ سوچتا رہا، اس کی بیوی کی خوراک کچھ اتنی نہیں۔ اگر دوسری عورتوں کی طرح اسے بھی وہ سب غذائیں مل سکتیں تو اس کا رنگ ان سب سے بہتر ہوتا۔ وہ جانتا تھا کیونکہ اس نے کبھی اسے اتنا خوبصورت کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کی حیثیت ہر کام میں ایک اہم رکاوٹ تھی۔ لیکن ہر وقت دب دب کر رہنے پر بھی وہ رک نہ سکا۔ کافی سوچ بچار کر اس نے چار انڈے خرید لیے ــــــ انڈے ایک مقوی غذا تھے۔

اس دن وہ غیر معمولی طور پر مغرور ہو گیا۔ وہ خود تندرست تھا۔ اسے ایسی غذاؤں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس نے انڈوں کا لفافہ میز پر رکھ دیا۔ بڑی بے چینی سے اس نے اپنی بیوی کو آوازیں دیں۔

"دیکھو۔ تمہارے لئے میں کچھ لایا ہوں۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ دونوں مسکرائے۔ اسے تسکین ہو گئی۔ اس کی بیوی نے انڈے اندر رکھ دیئے۔ پھر وہ اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اس کی بیوی کھانا پکانے میں مشغول رہی جہاں باورچی خانے کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہو گئی تھیں، اور مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کا خیال بچوں کے شور و غل میں بٹ گیا۔ ویسے بھی وہ اس قسم کی باتیں جلد بھول جاتا تھا۔ یہ بہتر بھی تھا۔ محض ذہنی تکلیف کے وہ اور کیا کر سکتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد آج اسے میٹھی چیز ملی۔ اس قسم کی فضول خرچی وہ کبھی کبھی کر لیا کرتے تھے لیکن وہ حیران رہ گیا۔ وہ خود اور اس کے بچے انڈوں کا حلوہ کھا رہے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرے

پر عجیب قسم کی سرخی تھی۔ اسے خود کبھی اس بات کا خیال نہ آیا تھا کہ وہ ماں بھی تھی اور اپنے بچوں کے بغیر مقوی غذائیں ۔۔۔ ؟

اسے یقین ہوگیا۔ اس کے بس میں کچھ بھی نہیں۔ اس کے معیار کے آدمی کے لئے ایسی فضول خرچی اچھی نہیں۔ جب کبھی اس کا دل اداس ہو جاتا تو وہ خاموش کسی ایسی پرلطف فضا کو ڈھونڈتا رہتا جس کی قیمت وہ بخوشی ادا کر سکے۔ اندھیری رات میں اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے روشنی پھیل جاتی۔ وہ کمرے کی ایک ایک چیز دیکھ سکتا تھا۔ نزدیک ہی اسے اپنی بیوی نظر آجاتی ۔۔۔ !

× × × × ×

پھر ایک روز اس نے اپنے کانوں سے سنا۔ وہ باقی سب کچھ سمجھ کر خاموش ہوگیا۔ دایہ کو اس نے چند سکے تھما دیئے۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس پر کوئی سوچ بچار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اس کی اتنی حیثیت نہ تھی کہ وہ ان کی ہر امید کو پورا کر سکتا۔ اور ان کی ہر چاہت کو سن سکتا۔ اس کے بچے بڑے لاڈلے تھے لیکن اس کا بس نہ تھا اور نہ وہ ان کی ننھی ننھی مسکراہٹوں کو ہر وقت دیکھتے رہنے کا آرزو مند تھا اور اس کی زندگی کا مقصد ہی کیا رہ گیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک ان بچوں کی خاطر تو کام کرتا تھا لیکن وہ کتنا ناکارہ تھا کہ ان کی کوئی ضرورت پوری نہ ہو سکتی تھی۔

وہ خاموش صحن میں بیٹھا اپنی بیوی کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے ساتھ اسے ہمدردی ہوئی۔ پھر اسے وہ سب بھوتوں کی طرح

اپنے پیچھے لگے محسوس ہونے لگے۔ سب کچھ سوچ کر ہی اسے ہول آنے لگا۔ دایہ کو دیئے
سکوں کی سختی اب تک اس کی انگلیوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی مختصر سی آمدنی میں
اتنے آدمیوں کا گزارہ واقعی ایک معجزہ تھا۔ اور ایک دنیا کی دنیا بڑھی چلی آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ ایک بار پھر اس سطح سے ابھر آیا۔ جانے کونسی
حقیقت تھی اور کیا تصور تھا۔ بہر حال انہیں بھوک لگی تھی اور ان کے دماغ کسی
خواب کو دیکھتے تھے۔ وہ ان دلچسپ حقیقتوں کو چھو لینا چاہتے تھے کیونکہ ان سب کے
ضمیر حساس تھے۔ وہ چند باتیں جان گئے تھے۔

اس کے ذہن میں سینما کی پچھلی سیٹیں تھیں۔ اونچے طبقے کے ریستوران
تھے۔۔۔عالیشان عمارتیں تھیں۔ تیز رو موٹریں تھیں۔ وہ ان خرچوں سے فرصت پانا چاہتا
تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مہنگی خوشبوں سے ہٹا لیا تھا محض اپنی مختصر آمدنی میں
گزارہ کرنے کی خاطر لیکن بڑھتے ہوئے اخراجات اس کا گلا دبوچنے لگے تھے۔ وسیع ہوتا
خاندان اتنا دلچسپ نہ تھا ـــــ جانے یہ کن کرموں کا پھل تھا۔ جانے اس کی تقدیر
کس برے لمحہ بنی تھی ـــــ جانے یہ کس کا قصور تھا۔ وہ اپنا ہاتھ کسی ماہر جیوتشی
کو دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی خوبصورت لمحہ بھی ہے کہ نہیں۔ تاہم
باہر صحن میں وہ اپنی بیوی کے سارے کام ختم کر لینے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ابھی
ڈوبے ہوئے سورج کی کرنیں سیاہی پوری طرح تبدیل نہیں ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر
میں ہو جائے گی۔

وہ منتظر تھا ـــــ

بشنداس

جب وہ اس بان کی چارپائی پر بے بس لیٹے لیٹے دہاڑیں مارنے لگتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک دن اتنا بڑا ہو جائے گا۔ پھر اس کے پاؤں میں اور اس کے باپ کے پاؤں میں کوئی فرق نہیں ہوگا اور لوگ اس کے باپ کی طرح اسے بھی بابوجی کے عام خطاب سے نوازیں گے۔

اس کا باپ اپنے خیالات کا خود مالک تھا۔ وہ تیز مزاج تھا لیکن ساتھ ہی ہر بات کو سماجی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا عادی تھا۔ بیٹے کی پیدائش سے پہلے اس نے کبھی اپنے مستقبل کو نہیں سوچا تھا لیکن اب جب کہ وہ باپ بن گیا۔ اسے اپنے بیٹے کی پرورش کا بے حد فکر تھا۔

ان کا چھوٹا سا گھر، ہر وقت بکھری چیزوں سے پٹا رہتا۔ اس کی بیوی عام عورتوں کی طرح ہر بات کو دل میں ڈال کر چبانے کی عادی ہو گئی تھی۔ کبھی اس کے ہونٹ ہی ہلتے مگر جب اسے کسی بات کا سخت احتجاج کرنا ہوتا تو وہ زور زور سے

بڑبڑاتی لیکن اس کے الفاظ نہایت غور سے سننے پر بھی صاف سنائی نہیں دیتے تھے۔ خاموش رات کی آوازوں کی طرح اس کے کانوں میں گونجتے۔ اس دوران میں وہ سانس کس چالاکی سے لیتی، یہ اچنبھا تھا ـــــ بیوی اور خاوند دونوں معمولی ناک نقشے کے تھے۔ چنانچہ بچے کی شکل صورت ایسی ہی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں باپ کی طرح کمزور تھے۔

بیٹا پیدا ہوتے ہی علاقہ کے پنڈت نے مہورت نکالا، ہر لحاظ سے بچہ نیک ساعت میں تھا مگر وہ روتا بہت تھا۔ طرح طرح کے شکوک ماں باپ کو مارے ڈالتے۔ اس بارے میں وہ دونوں نادان تھے ہر وقت وہ حکیموں ڈاکٹروں کی جیبیں بھرتا رہتا۔ ڈاکٹر آتے اور بچے کو دیکھ کر لوٹ جاتے۔ ان دونوں کی تسلی ہو جاتی لیکن بچہ بدستور چیختا رہتا۔ اور وہ دونوں لالٹین کے پاس بیٹھ کر ایک دوسرے کے چہرے پر کسی علاج یا نسخے کے پڑھنے کی کوشش کرتے۔

اپنے امراض کے لئے وہ ہر طرح سے مکمل حکیم ڈاکٹر یا وید ہو سکتا تھا۔ لیکن بچے کے ذرا چیخنے چلانے پر وہ بے بس ہو جاتا۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کبھی وہ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے دماغ پر سنجیدگی سے زور ڈالتا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس کی آنکھوں میں گرم انگارے تڑتڑاتے اس کے کانوں میں شور مچنے لگتا۔ وہ بوکھلا جاتا۔ پھر زور زور سے فرش پر آواز پیدا کرتا ہوا ادھر اُدھر ٹہلنے لگتا۔ جب کبھی اس کا ذہن پریشان ہو کر کند ہو جاتا۔ تو بیزاری میں اس کے منہ سے چند نامناسب الفاظ نکل جاتے۔

"رامو! ـــ تو تو ماں ہے۔ کہتے ہیں ماں کا دل بچے کی ہر بات کو سمجھ لیتا ہے۔ تو ماں ہے لیکن مجھے نہیں بتاتی۔ اسے کیا چاہیئے ــ؟"

ذرا سے اشارے پر وہ مارنے مرنے کو تیار ہو جاتی۔ وہ بڑبڑانے لگتی۔

وہ اسے بھی کوستی، بچے کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ جب اس کا مزاج زیادہ چڑچڑا ہوتا تو یہ کوسنے اپنے والدین، خاوند کے والدین بلکہ خدا کو بھی مسل دیتے مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا، تو یہ کس کا قصور تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت تک بولتی رہتی جب تک بچہ خاموش نہ ہو جاتا شاید یہ سمجھ کر کہ غصے کی وہ بھنبھناہٹ اس کے لئے لوری ہے۔

وہ بچے کو ایک عقلمند اور سنجیدہ فلسفی سمجھتے تھے اور ہر وقت اس کی حرکتوں پر حیران رہ جاتے۔ ان دونوں کو پوری امید تھی کہ بچہ ان کی زندگیوں کا نیا باب کھولے گا، ان کے نام روشن کریگا۔ کس طرح ۔ ؟ یہ وہ نہیں بتا سکتے تھے۔ انہوں نے اس سے زیادہ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ بچہ غیر معمولی شخصیت تھا۔ پرستش کے قابل اور اس کی ہر بات کو وہ دماغوں کی تہوں میں بٹھا لیتے۔ اس کے ذرا سے رونے پر وہ دونوں پریشان ہو جاتے۔ اس کی ضد پر وہ شکست مان لیتے۔ وہ انہیں اپنے اشاروں پر نچاتا۔ اپنے احکام صادر کرتا۔ انہیں غلام سمجھ کر ہر وقت خدمت طلب کرتا۔ وہ کتنی آرزوؤں تمناؤں کے ساتھ اسے بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ جو کسر باقی تھی۔ وہ اس طرح پوری ہو گئی کہ اس کا نام لشنداس نکلا۔

اس کی آنکھوں میں، اس کے چہرے پر بلکہ سارے وجود میں ایک سرور جھلکتا محسوس ہونے لگا۔ اس کی عظمت بالاتر ہو گئی۔

اگر اسے دفتر کا کام نہ ہوتا اور اگر ردیوں کے نوٹ خود بخود اس کی جیب کی پناہ ڈھونڈ سکتے تو وہ اپنے بچے کے سرہانے ہر وقت بیٹھا رہتا۔ وہ اس کے ساتھ سارا سارا دن گھومتا رہتا۔ اس کا چہرہ صاف رکھتا، اسے کپڑے خود پہناتا، اس کی آنکھوں میں کاجل اور ماتھے پر سیاہ ٹیکہ لگاتا لیکن دنیاداری کے دھندوں میں پھنس کر اس کا کتنا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ تاہم جب اس کو

فرصت ملتی وہ اپنے گھر دوڑ آتا اور بچے کو سنبھال لیتا۔ اس کی بیوی باورچی خانے میں مشغول رہتی۔ گھر کا سارا کام کاج وہ خود کر لیتی تھی بلکہ اگر کوئی اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا بھی تو اسے تکلیف ہوتی۔ اسے کوئی امداد نہیں چاہیئے تھی۔ اس کی وجہ اس کے دل کے سوا کسی کو معلوم نہ تھی۔ دراصل وہ اپنی بیوہ نند سے بچاؤ کی ترکیبیں سوچا کرتی تھی۔

اس کی بیوہ نند کے سہارے دو بھائی تھے۔ وہ اکثر اپنے دوسرے بھائی کے یہاں رہا کرتی۔ یہ بھائی آنے کے لئے بار بار لکھتا تو وہ آجاتی لیکن وہ جانتی تھی کہ یہاں اس کا گزارہ مشکل ہے۔

ننھے بھتیجے کو وہ ہر وقت گود میں اٹھائے بہلاتی رہتی لیکن اس کی ہر طرح مخالفت ہوتی۔ اگر وہ رسوئی میں نہ جاتی تو بھی ان لوگوں کی سرگوشی اُسے رُلا رُلا دیتی اور اگر وہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا چاہتی تو اسے کوسنے سننے پڑتے۔ چنانچہ وہ ہر وقت بچے کو لئے بیٹھی رہتی۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ لیکن خونی نسبت کے علاوہ دوسرے رشتے پختہ نہیں ہوتے اور بھائی کی بیوی اس کی کچھ نہیں تھی۔ وہ اس کے سامنے کہہ دیتی۔ "بہن کوئی کسی کو ہمیشہ کھلانے سے رہا۔ یہ نہیں ہو سکتا ——"

وہ خاموش، خلا میں گھورتی رہتی۔ جانے کیا سوچتی ہوگی۔ جب کوئی چارہ نہ ہو تو آدمی ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ ان الفاظ کو یوں بھول جاتی جیسے نہ اس نے کہے تھے نہ اس نے سنے تھے۔ تھک ہار کر اسے دوسرے بھائی کا گھر زیادہ آرام دہ محسوس ہوتا اور وہ جلد از جلد چلی جاتی۔

خاوند کے شوق کو دبانے کے لئے وہ بڑبڑاتی رہتی۔ "باپ ہو تو سب ہی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ہر کوئی بچوں کو پیار کر لیتا ہے۔ اور نہیں، تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ماں کے منہ پر لوگ ماموں خالہ بن بیٹھتے ہیں۔ ماں باپ نہ ہوں تو کوئی بچوں

کا نہیں ہوتا ـــــــ سب دکھاوے کی محبت کرتے ہیں لیکن میں تو جانتی ہوں۔"

اور وہ سہم جاتا۔ وہ سوچتا اگر اس کا دم نکل جائے۔ سچ مچ ان کا بیٹا یتیم ہو جائے گا۔ وہ اس قسم کی باتیں سوچتا رہتا۔ اسے اپنے بچے کے ساتھ اور بھی محبت ہو جاتی۔ وہ پہلے سے زیادہ دل بستگی کے ساتھ اسے چاہنے لگتا۔ اسے روتا دیکھ کر یہ احساس ہوتا گویا وہ اس کی بے نوائی کا منظر ہو۔ اور قدرت اسے دراصل بچے کے رونے کے ذریعہ ایسی باتیں سمجھا دینا چاہتی تھی۔

چنانچہ وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہی سوچ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے۔ سوائے اس بچے کے یا اپنی بیوی کے اسے کسی رشتہ دار سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور جب کبھی یہ دہشت انگیز خیال کہ اس کے بچے کا کیا ہوگا۔ اس کے ذہن پر پھیلنے لگتا تو وہ بارگاہِ عظیم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا۔ کھلبلاہٹ میں اس کے آنسو چھلک آتے۔ وہ کہتا "مجھے زندہ رکھ۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

ایک عجیب سایہ سا اس کے سامنے ہر وقت منڈلایا کرتا۔ وہ دیکھتا اس کی موت بالکل نزدیک ہے۔ وہ اپنے دل کی حرکت کا جائزہ لیا کرتا۔ اور کبھی اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ مر چکا ہے۔ پھر اس کا ہاتھ ایک تیز دھما کے کو محسوس کرتا اور وہ ہوش میں آجاتا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ بچے کو دیکھتا، اسے گلے سے لگا لیتا۔ اسے ہر طریقے سے خوش کرتا رہتا اور اس کی بیوی کہتی۔ "ماں باپ کے سوا بچوں کا کوئی نہیں ہوتا۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے۔ وہ سسکیاں لیتا ہوا اس خیال میں گم ہو جاتا۔

"مجھے زندہ رکھ، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ ہمہ تن بچے کی طرف رجوع کر لیتا۔

* * * * * * *

وہ اپنے آپ کو اور اپنی بیوی کو اس بچے کی پرورش کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ان لوگوں سے مشورے کئے جن کے بارے میں اس کے خیالات اچھے تھے۔ اپنے گھر کے نزدیک حکیم کی دوکان پر وہ ہر وقت بیٹھا رہا کرتا۔ وہاں اور لوگ بھی جمع ہو جاتے اور شام کے وقت حکیم کی دوکان ایک کلب بن جاتی جہاں وہ دنیا بھر کی گپیں ہانکا کرتے تھے اور حکیم اس بات پر خوش تھا کہ اس کی دوکان میں رونق رہتی تھی۔ حالانکہ ان سب میں اس کا مستقل گاہک وہی تھا اور اسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی دوا وہ دیتا رہتا۔

وہ حکیم کو اور حکیم اسے اپنا ہم راز سمجھتا تھا۔ لیکن وہ اس کے علاوہ بھی ہر کسی سے مشورہ لینے میں کوتاہی نہ کرتا تھا۔ وہ ہر کسی کی غور سے سنتا تھا اور ماننے کی کوشش کرتا۔

کچھ دنوں سے لوگ کہنے لگے تھے کہ اب اس کا بیٹا کافی بڑا ہو گیا ہے۔ وہ اسے مشورہ دیتے کہ اسے اسکول میں بھیجنا چاہیے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس پانچ برس کے بچے کو کبھی سکول نہ بھیجتا۔ لیکن وہ جو کچھ کہتے تھے اسی کی بہتری کیلئے تھا۔

اس نے لشند اس کو سکول میں داخل کر دیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے استادوں کو اپنے بچے کے بارے میں احتیاط سے کام لینے کی درخواست کی۔ وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رہتا۔

ہر روز صبح وہ بچے کو اسکول کے کمرے میں پہنچا کر اور اسے ماسٹر کے سپرد کر کے واپس لوٹتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے۔ وہ بیوی سے بڑے کرب میں کہتا۔ "ننھا سا گوشت پوست کا بچہ"

اس کے ہاتھوں میں قلم دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ جماعت کے دوسرے لڑکوں میں وہ بالکل دودھ پیتا سا لگتا ہے۔"

آہستہ آہستہ ایک عجیب سا خوف اس کے ذہن کے ہر حصے میں لرزنا شروع ہوا۔ اس کی فائیلوں میں، میز کرسی پر، اس کی پیٹھ پر، سر کے نزدیک تر ـــــ ایک سایہ ہاتھ پاؤں پھیلانے لگتا۔ اس کی بیوی کے الفاظ گویا کسی اشتہار کے موٹے موٹے حرفوں میں صاف صاف لکھے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے چمکنے لگتے۔ بے آواز ٹمٹماتے تاروں کی طرح چمکتے ہوئے۔ وہ پڑھنے لگتا۔ "ماں باپ کے سوا بچوں کا کوئی نہیں ہوتا۔"

ہر روز وہ ہڑبڑا کر گھڑی کی طرف دیکھتا۔ پورے ساڑھے چار بجے وہ لشتم پشتم اس کو سکول سے لانے کے لئے دوڑ پڑتا۔ وہ ہانپتا ہوا اسے اٹھا لیتا۔ "بیٹا چھٹی ہو گئی۔"

پھر وہ اسے سائیکل پر بٹھا کر گھر لے آتا۔ راستے میں وہ اسے ماسٹروں کے برتاؤ کے بارے میں پوچھتا۔ پھر ماسٹروں سے اور زیادہ عاجزی سے عرض کرتا۔ اسے اس بات کا پورا اطمینان اور یقین تھا کہ اس کا بیٹا لشتم پشتم ایک بہت بڑی ہستی ہے جسے پورا آرام بہم پہنچانا اس جیسے غریب آدمی کے بس کی بات نہیں۔ وہ چپکے چپکے اپنے خدا سے کہتا۔ جانے کیا کچھ۔

لیکن وہ ایک ادنیٰ سرکاری کلرک تھا اور اس کی تنخواہ بہت کم تھی اور اس کا بیٹا ایک عام سے سکول میں تعلیم پا رہا تھا اور اس کے

خیالات کی نشوونما باپ اور ماں کی شفقت کے زیر سایہ تھی اور ماں باپ اسے ترغیب دیتے۔ کبھی وہ فوج کی افسری کا گمان دماغ میں بھر لیتے اور پھر وہ اپنے حلقے میں بیٹھ کر سب سے مشورہ کرتا۔ "فوج میں افسر بننے کے لئے آدمی کس طرح کوشش کرے۔؟"

اس کے گھر کے بائیں طرف بنیئے کی دوکان تھی۔ وہ ہنس کر کہتا۔ "بھیّا تمہارا رابرٹ کبھی فوج میں جائے گا۔ اور تم بھی جاؤ گے۔ گلی کے بچّوں سے تو تم اسے ملنے نہیں دیتے۔ کبڈی تک تو کھیلتا نہیں۔ وہ فوج میں اتنا بوجھ اٹھائے گا کیسے۔؟ ذرا بچے اسے چھیڑ دیں تو اتنا بڑا لڑکا رونے لگتا ہے۔ اس کا منہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ یہ فوج میں جائیں گے۔!"

پھر وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان باتوں کو برداشت کر لیتا۔ لیکن اس کا لڑکا ان تمام بچوں کے ساتھ کبڈی یا گلی ڈنڈا کھیلے، یہ اسے پسند نہ تھا۔ ان بچوں کی بری عادتوں سے بچانے کے لئے وہ اور کڑی نگرانی کرتا۔ لہٰذا اس کے پاس ایک پرانی ٹینس کی گیند ہی کافی تھی۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر کئی کئی بار گیند کو ہاتھ سے زمین پر اچھالتا اور جب گھر کے دروازے پر دستک ہوتی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ گیند ایک طرف لڑھک جاتی۔ وہ دروازہ بند کر کے کمرے کے سوراخوں میں سے جھانکتا اور جب اجنبی مہمان کے سامنے اس کی ماں اسے بلاتی تو اسے ایسا لگتا کہ اسکا دل بند ہو جائے گا اور اس کے پسینے چھوٹ جاتے اور اس کی آواز بھرا جاتی۔

بڑی مشکل سے وہ نمستے کہتا اور جب اجنبی شفقت کی خاطر پوچھ لیتے۔ "بیٹا، کس جماعت میں پڑھتے ہو۔"

تو وہ خاموش زمین پر نظریں گاڑ دیتا اور اس کی ماں جواب دیتی۔
——" ساتویں میں۔"
اور اجنبی اس کی پیٹھ سہلاتا —— " شاباش، شاباش۔"
اور اسے احساس ہوتا۔ اس پر بیہوشی طاری ہو جائے گی۔

× × × × ×

رفتہ رفتہ فوجی افسری کے خواب پرانے ہو گئے۔ اور جب بشنداس ساتویں میں پاس ہوا تو جماعت میں اس کا بائیسواں نمبر تھا لیکن پھر بھی اس خوشی میں اس کے باپ نے اپنے احباب میں لڈو بانٹے۔ ایک شام اس نے اپنے بچے کو بتایا کہ بڑی سرکاری نوکری کے لئے خاص امتحان میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ کافی دیر تک وہ دونوں اس بارے میں سوچتے رہے۔ وہ ایک خوبصورت کمرے میں بیٹھا ہوا، محض فائیلوں پر دستخط کر رہا ہے۔ اس کی جیب میں کئی سو روپے ہیں۔ اس کے ماں باپ ایک عالیشان مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے دل میں کتنی امیدیں تھیں، وہ اندازہ نہ کر سکے۔

اس شام وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ اپنے خیالات کو پختہ کرنے کے لئے حسبِ معمول جب وہ حکیم کی دوکان پر گیا تو بیٹے کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ اس نے اپنے خیالات دوستوں میں مشہور کر دیئے۔ سب خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر حکیم نے پوچھا —— " اور تو سب ٹھیک ہے لیکن جب افسر لوگ انٹرویو لیں گے تو بھلا سامنے جاتے ہی کیا کہو گے۔؟"
بشنداس بدحواس ہونے لگا۔ " کیا کہو گے۔؟" حکیم نے

تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

"صبح ہو گی تو گڈ مارننگ اور دوپہر کے بعد ـــــ" اس کے باپ نے مدد کی ـــــ "تم نہ بولو ـــ" حکیم نے ٹوک دیا۔ "میں نے تو ان سے پوچھا تھا۔"

پاس کی دوکان سے بنیے نے ہنس کر کہا ـــــ "وہاں کبھی تو سانتھ جائیں گے نا یہ ـــ ہمارے بھی بچے جاتے ہیں سکول میں ـــ اب یہ اتنا بڑا ہے اور باپ سکول چھوڑنے اور لانے کے لئے نوکر لگا ہوا ہے ـــــ کبھی سنا بھی ہے ـ؟"

"بچوں کی حفاظت بہت ضروری ہے سیٹھ جی۔" اس نے کہا۔ "آپ نے دیکھا ہے۔ اکثر بچے کتنے شیطان ہوتے ہیں۔"

لیکن بنیے نے نہیں سنا۔ "اور میاں جب وہ پوچھیں گے افسر لوگ کہ کون سا کھیل کھیل سکتے ہو۔ پھر کیا جواب دو گے ـــ؟ تم نے کھیل کے میدان دیکھے بھی ہیں ـ؟"

وہ بھی شرمندہ ہو کر ہنسنے لگا۔ "بھئی وہاں فائلیں دیکھنی ہیں یا میچ کھیلنے ہیں۔ تم بھی لالہ حد کرتے ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ـــــ" حکیم نے بتایا۔ "دراصل ہمیشہ کھیل کا مسئلہ ہوا ہی کرتا ہے۔ آخر تمہاری طرح تو نہیں کہ جا کر کلرک بھرتی ہو گئے۔ یہ تو افسری باتیں ہیں۔"

بیٹے کے افسر کہلانے کی خاطر وہ یہ بھی برداشت کر گیا۔ لیکن وہ بیٹے کو سکول خود چھوڑنے جاتا۔ اور ہمیشہ پانچ بجے ہڑبڑا کر سکول کی طرف بھاگتا۔ اس نے اتنے طعنوں کے باوجود اپنا رویہ وہی رکھا۔ اور

اس کا بیٹا اسکول کے کام کے علاوہ ماں کے ساتھ گیند کھیلا کرتا۔ اور اجنبی دروازہ کھٹکھٹاتے رہتے اور وہ کمرے کو بند کر کے سوراخوں سے جھانکتا رہتا۔

میٹرک میں اس نے بیٹے کے لئے ایک استاد تجویز کیا کیونکہ اتنے مشکل امتحان کا پاس کرنا اس کے بیٹے کے لئے مشکل ہی تھا چنانچہ اس کے کمند ذہن ہونے کی وجہ سے ماسٹر گھر میں آکر اسے پڑھایا کرتا۔ اس بات کا چرچا بھی عام ہو گیا تھا۔ اس کے ہر فعل پر اس کے احباب نکتہ چینی کرتے تھے۔ وہ اسے صاف صاف کہتے ــــــ "تمہارے یہ چوچلے اس غریب کے دماغ کی رگیں کمزور کر دیں گے۔ آخر اسے دنیا میں رہنا ہے۔ ساری عمر تم ....''

ہمیشہ ایسے موقع پر خطرے کی گھنٹی اس کے دماغ میں بجنے لگتی۔ وہ الفاظ گہری سیاہی میں لکھے اسے نظر آتے۔ ماں باپ کے بعد ...... ماں باپ کے بعد۔ ......

آنکھوں میں آنسو بھرے وہ خدا سے دعا مانگتا ــــــ "مجھے زندہ رہنے دو۔ مجھے .....''

اس کا دبلا پتلا لڑکا بہت جلد گھبرا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی اس کے ساتھ بیٹھ کر مغز مارتا۔ وہ اسے بڑا بنانے کی کوشش کرتا۔ وہ اسے اکثر سمجھاتا۔ دنیا میں کس طرح چلتے برتتے ہیں۔ لیکن ایک نامعلوم خوف بدستور اس کے دل میں تھا۔ وہ کسی سے ملنے سے انکار کر دیتا۔ اسے صرف دو چیزیں عزیز تھیں۔ سکول پہنچ کر پڑھنا۔ یا ماں باپ سے باتیں کرنا ـ ـ ـ وہ اسی ماحول سے مانوس تھا۔ دفتر کے بارے میں سوچ کر وہ بالکل بدحواس ہو جاتا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے قلم پکڑ کر میٹرک کے امتحان کی تیاری میں لگا رہتا۔ لیکن وہ جو کچھ ایک بار پڑھتا اسی اجنبیت سے اسے دوبارہ رٹنے کی کوشش کرتا۔ وہ پڑھ چکنے کے بعد سب کچھ بھول جاتا۔ امتحان کا

خیال کر کے اس کا دم بھولنے لگتا - وہ اپنی بھرائی آواز کو صاف کرنے کی کوشش میں کہتا۔
—— "جانے ، امتحان کیسا ہو گا - ؟"

اگر اس کے باپ میں اتنی جرأت نہ ہوتی تو شاید وہ خود بھی رو دیتا - لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پاکر سمجھاتا —— "واہ - ہر سال ہزاروں لوگ میٹرک پاس کرتے ہیں - تعلیم کی یہ بہت ضروری منزل ہے - اس کے بغیر آدمی کچھ نہیں -"

وہ بھی یہ سب کچھ جانتا تھا - بڑی مشکل سے اس نے وہ امتحان دیا -
امتحان دلوانے کے لئے اس کا باپ اور استاد بھی ساتھ ہو لیتے - وہ ہال میں پہنچ کر اسے جگہ پر بٹھاتے - وہ خود اپنی جیب سے قلمیں پنسلیں اور ربڑ وغیرہ اس کی میز پر رکھتا - لوگوں کے اعتراض پر وہ کہتا —— "یہ مذاق نہیں ، اور اگر وہ بیچارہ کوئی چیز بھول ہی جائے - تو - ؟"

وہ اسے ہر بات سے آگاہ کرتا - اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرنے کی کوشش کرتا - اسے ہنسانے کے لئے ہر ممکن ترکیب کا استعمال کرتا - جب وہ امتحان میں بیٹھ جاتا تو وہ انتہائی فکر میں واپس آتا - اس وقت وہ چاہتا کہ ایک کونے میں بیٹھ کر کافی عرصہ روتا رہے - جانے کیوں - ؟

وہ اسے خود واپس لانے کے لئے وہاں پہنچ جاتا - سوال پر سوال کر کے وہ اس کے رہے سہے ہوش بھی ختم کر دیتا - وہ بھرائی ہوئی آواز سے کہتا ——
"جو کچھ کر آیا ہوں ، اب کیا ہو سکتا ہے -"

خاموشی سے وہ دونوں گھر کی طرف چل دیتے - وہ کسی روز بھی اس کے پرچوں سے مطمئن نہ ہوا - لیکن گھر کے نزدیک پہنچتے ہی لوگ وہیں سے پوچھتے تو وہ جواب دیتا - "بہت اچھا ہو گیا ہے - آج تو اس نے حد ہی کر دی ہے - اب آگے پڑھاتا ہے۔"

امتحان کے بعد ان کے خوابوں کی دنیا پھر سے روشن ہو گئی۔ وہ کبھی اپنے بیٹے کو فوج میں افسر بنا سوچتا اور کبھی دفتر میں حاکم بنا دیکھتا۔ احباب کے ساتھ اس کے مباحثے زیادہ جوش سے ہوا کرتے۔ ہر کوئی اپنا اپنا خیال ظاہر کرتا۔ وہ ساری ساری رات سوچتا رہتا۔ دونوں میاں بیوی اب زیادہ فکر مند تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی پنشن ہو جانی تھی چنانچہ وہ کافی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا۔ اس کا محض ایک موضوع تھا۔ اور وہ اس کے بیٹے کے بارے میں تھا۔ ایک بات کا اعتراف اس کے لئے بہت غم ناک تھا اور وہ یہ کہ دفتر میں حاکم بننے کے لئے اس کے بیٹے کو بی۔ اے پاس کرنا چاہیئے۔ اس نے یہ افسوس ناک خبر سناتے وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا خاص خیال رکھا۔ اب محض دو باتیں تھیں۔ یا تو اس کا بیٹا بی۔ اے میں پڑھنے لگے یا وہ ملٹری کا خیال کرے۔

کافی عرصہ وہ انہیں خیالوں میں غرق رہا۔ اس کے پنشن پانے میں ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ اسے اس کے ساتھی نے بتایا کہ ان کے دفتر میں چند نئے کلرکوں کی ضرورت ہے۔ وہ اس سے کافی دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتا رہا۔

دوسرے دن وہ اسے پھر ملا۔ بیٹے کو ساتھ لے کر وہ افسروں کے کمروں کے باہر گھنٹوں کھڑا رہتا۔ ہاتھ جوڑتا اور اپنے افسر سے ملنے کے لئے بے چین رہتا۔ اس کے ساتھی اس پر اس کا مذاق اڑاتے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے پر ہر قسم کی ذمہ داری چھوڑنے کو کبھی تیار نہ تھا۔ وہ خود افسروں سے ملا۔ اس نے ایسی باتیں کیں جیسے اسے اپنے لئے ملازمت چاہیئے۔ اور آخر مہینے کے اندر ہی اندر جب اس کے بیٹے کا نتیجہ نکلا اور وہ پاس ہو گیا تو وہ اس دفتر میں کلرک بھرتی بھی ہو گیا تھا۔

یہ کتنی بڑی خوش قسمتی تھی۔ وہ خود پنشن پا کر دفتر سے الگ ہو چکا تھا۔

اس کا زیادہ تر وقت بیٹے کی بہتری کے متعلق سوچنے اور گھر کا کام کاج کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے دوست اس کی تعریف ضرور کرتے تھے لیکن وہ اس کے بیٹے کے بارے میں کچھ خفا تھے۔ وہ اس بارے میں اسے شرمندہ کرنا چاہتے کہ وہ خود اب تک ایک صابن کی ٹکیا خریدنے کے قابل نہ ہوا۔ وہ اسے دفتر کے بارے میں مذاق کرتے۔ اور اسے چڑانے پر تلے رہتے۔ ان کے مذاق باپ بیٹے کو بہت چبھتے تھے لیکن وہ ملال ظاہر نہ ہونے دیتے۔ وہ سب کچھ برداشت کر لیتے۔

اگلے مہینے کی پہلی تاریخ سے اس کے بیٹے کو دفتر میں جانا تھا۔ وہ اس بات پر پھولا نہیں سماتا تھا۔ فوج کی افسری کو ویسے بھی اس نے کبھی پسند نہ کیا تھا۔ وہ کہا کرتا۔ "فوج کی نوکری بھی کوئی نوکری ہے۔ نہ جان کی سلامتی۔ نہ آرام کا لحاظ۔"

دفتر کی حاکمانہ کرسی کے لئے وہ کچھ عرصہ اور انتظار کر سکتے تھے۔ آغاز تو ہو ہی چکا تھا۔ مہینے کی یکم کو اس کا بیٹا صبح صبح اٹھا۔ وہ تیار ہو کر مندر میں گئے۔ بازار کھلنے لگا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ کافی ہو چکی تھی۔ صبح سویرے ہی حکیم کی دوکان کھل جاتی تھی۔ اور ساتھ ہی بنیئے کی دوکان بھی اسی وقت کھلتی۔ وہ سب خوش تھے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب اس کے بیٹے نے آخر دفتر جانے کی تیاری کی۔ اپنے باپ کی سائیکل کو وہ ہفتہ بھر سے چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جان پہچان والے بھی اس کے ملازم ہونے پر دل ہی دل میں خوش تھے۔

آخر وہ دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا باپ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سائیکل تھا۔ گھر کے دروازے پر آ کر بیٹے نے ماں کو نمسکار کیا۔ سکول کے دنوں کی طرح باپ نے اسے آگے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود اچھل کر گدی پر بیٹھ گیا۔ وہ بیٹے کو دفتر چھوڑنے گیا تھا۔

حکیم اور بنیا اور دوسرے دیکھنے والے اس کی اس حرکت پر گم سم تھے۔ لالہ نے حکیم کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی شیشیوں کو صاف کرنے لگا۔ "ہونہہ" اس نے کہا۔

دفتر چھوڑ کر جب وہ واپس آیا تو حکیم نے اسے روکنا چاہا۔

"یہ کیا غضب کرتے ہو۔ بیٹے کو پاگل بنا کر چھوڑو گے۔ بھئی دفتر میں بھی ———" اس نے جلدی سے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ اس نے ان کی باتوں کا کوئی خیال نہیں کیا۔

گھنٹہ گھر کے الارم کو سننے کے لئے وہ کان لگائے بیٹھا رہا۔ اسے اس بات کا فکر تھا کہ کہیں وہ شام کے پانچ بجے کا الارم بھول نہ جائے۔

کڑوے سانس

اس چمکتے قلعی شدہ گلاس میں پانی بھرا تھا۔ اس نے پینے کے لئے منگایا تھا۔ اسے بڑی پیاس تھی لیکن اب وہ پانی پی نہیں رہا تھا۔ اس نے گلاس کو کرسی کے بازو پر رکھا تھا اور وہ پانی کی سطح پر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

کتنے عرصے سے وہ چڑچڑا رہا تھا۔ وہ بھول گیا تھا اسے خوشی کا احساس کئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔ اسی بارے میں وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک چیونٹی کا تعاقب کر رہی تھیں جو پانی کی سطح پر تڑپ تڑپ کر گھوم رہی تھی۔ وہ کسی طرح گلاس کے کناروں تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اسے چیونٹی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ چیونٹی اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ اس نے اپنے ہاتھوں تک غصے اور احتجاج کی کپکپاہٹ نہ جانے دی تھی تاکہ پانی میں لہریں نہ پیدا ہوں اور چیونٹی ساکن سطح پر جلد از جلد کنارے تک پہنچ جائے۔

چیونٹی یکدم تیرتی کنارے تک پہنچی۔ نامعلوم پھر وہ درمیان آجاتی

اور پھر چکر کاٹنے لگتی۔ اس کا منہ سطح آب سے اوپر ابھرا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ پناہ مانگ رہی تھی۔ وہ ہمدردی اور رحم کی التجا کر رہی تھی۔ وہ مدد اور حوصلے کے لئے بے چین تھی۔ اور واپس درمیان لوٹ جاتی تھی۔ پانی میں سے نکل آنا اس کے لئے مشکل تھا۔ وہ پھر اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے غصے اور رنج کی انتہا ہو گئی۔ وہ چڑ گیا۔ احتجاج سے اس نے چیخ کر آواز دی۔ "شیلا۔"

جواب نہیں آیا۔ وہ غصے میں کانپنے لگا۔ اگر وہ چاہتا تو انگلی سے چیونٹی باہر پھینک سکتا تھا۔ یکدم وہ پانی سوکھ جانے پر تھوڑا وقفہ گھٹتی اور آخر تیزی سے چلی جاتی۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ چیونٹی اب زیادہ تھک گئی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک ہلکی جنبش کرتی اور پھر پانی پر اپنا آپ چھوڑ دیتی۔ وہ غصے سے کانپ گیا۔ وہ دوبارہ آواز دینے لگا تھا لیکن اس کے آجانے پر وہ رکا۔ اس نے تیز تیز آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "میں نے پانی مانگا تھا۔ پانی، پینے کے لئے۔"

"آپ کے ہاتھ میں کیا پکڑا ہے۔؟"

"یہ پینے کا پانی ہے۔" اس نے حیرت سے کہا۔

وہ خود حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس میں ایک چیونٹی ہے ——— "اس نے کرب سے کہا۔ "تم نے پانی دیتے وقت دیکھا بھی نہیں۔"

چپکے سے اس نے گلاس لیا۔ چیونٹی ابھی تک پانی سے جدوجہد کر رہی تھی۔ گلاس میں طوفان برپا ہو گیا۔ چیونٹی جھلا کر پھر کوشش کرنے لگی۔ شیلا نے تھوڑا سا پانی صحن کی نالی میں گرا دیا۔ چیونٹی غائب ہو گئی۔ چیونٹی یقیناً گہرے اور خوفناک مدوجزر میں مبتلا ہو چکی تھی۔ یا موت کی گود میں جا چکی تھی۔ وہ پانی نہیں پی سکا۔ اسے تکلیف ہوئی۔ چیونٹی کے مر جانے پر اُسے

بڑا افسوس ہوا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ پانی میں تڑپتی چیونٹی کی مدد نالی کے کیچڑ اور آخر میں مار کر ہو گی تو وہ پہلے ہی اسے انگلی سے باہر نکال دیتا۔ اب کم از کم اس پانی کو پینے کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ وہ اب تازہ پانی پینے کا بھی خواہشمند نہ تھا۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اندر کمرے میں چلا گیا۔ باہر اس کی بیوی نے پانی پھینک کر گلاس کو ایک میز پر دے مارا۔

وہ بھول جانا چاہتا تھا کہ ابھی ایک ذرا سے واقعے پر وہ اور اس کی بیوی بدمزگی پیدا کر چکے ہیں۔ لیکن تڑپتی ہوئی چیونٹی اس کی آنکھوں کے سامنے جدوجہد کرتی نظر آتی تھی۔ اس کی بند آنکھوں کی سیاہی میں موجود تھی۔ اس نے بیوی کو دل ہی دل میں کوسا۔ پھر اس نے کمرے میں بائیں طرف بڑے خوبصورت بستر پر ایک چھوٹے سے بچے کو دیکھا۔ بچہ خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے حرکت تھے۔ کتنی کتنی دیر تک وہ اسی ایک پہلو پر خاموش بے حس پڑا رہتا تھا۔

اسے پھر چیونٹی نظر آنے لگی۔ اس بار جدوجہد کے بغیر۔ کشمکش ختم کر چکی چیونٹی۔ گندی نالی کی سیاہی میں کیچڑ میں سے آہستہ آہستہ گزرتے پانی کی سطح پر نامعلوم زندگی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو جھٹکا دیا۔ آخر چیونٹی کے اس حادثے میں کیا حیرت تھی۔

چنانچہ وہ اپنے بچے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا بیٹا اس وقت ڈیڑھ برس کا تھا۔ کوئی اسے چھ مہینے سے زیادہ نہیں کہے گا۔ وہ اسی لئے پریشان تھا۔ کیا وہ خود کو ایک مغرور باپ کہہ سکتا تھا۔؟ اس بچے نے کبھی اسے نہیں بلایا۔ اس بچے نے کبھی ماں کو نہیں چاہا تھا۔ اس نے کبھی کوئی لفظ نہیں دہرایا۔ ...... ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بچہ گونگا تھا۔ اس کا بیٹا بالکل گونگا تھا۔

اس کا بیٹا ساری عمر کیونکر گزار سکے گا۔؟ وہ دنیا میں کس طرح کامیاب ہو سکا۔؟ وہ آخر کریگا کیا۔؟

اس نے اپنے ماں باپ کے پیار بھرے مظاہروں کا جواب کبھی نہیں دیا تھا۔ وہ ان کے کتنے عرصے تک بلانے اور احتجاج کرنے پر بھی ان کی طرف مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بچہ بہرہ تھا۔!! اس کے کانوں میں کسی قسم کی آواز کا احساس قطعی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارہ زندگی بھر اس نعمت سے محروم رہے گا۔

وہ اندھا تھا۔ وہ آنکھیں نہیں کھولتا تھا۔ وہ اگر کبھی دیکھنے کی کوشش بھی کرتا تو ایک مظلوم کی طرح ہر طرف جھینپ جھینپ کر آنکھیں پھیلاتا اور پھر بند کر لیتا۔ وہ غریب بیچارہ چھوٹا سا بچہ اس کی زندگی میں سب سے بڑا کانٹا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے نہ ہنس سکتا تھا نہ لطف لے سکتا تھا۔ نہ دلچسپی محسوس کر سکتا تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو بد قسمت مانتا تھا۔ لیکن اس بچے نے اسے ہر لحاظ سے تباہ و برباد کر دیا۔ اس کی ذہنی اور عملی قوتیں دب گئی تھیں۔

اس کی بیوی تندرست تھی۔ وہ خود ہر لحاظ سے تندرست تھا۔ ان کا گھر صاف ستھرے مقام پر تھا۔ ان کی زندگیاں ان کے خیالات پاکیزہ تھے۔ پھر وہ قدرت کی غلطی ان کے یہاں کیونکر نازل ہوئی۔ وہ بچہ لاکھوں کروڑوں بچوں کی طرح ان کی زندگیوں میں مسرت اور خوشی کیوں نہ لا سکا۔ کیا وہ واقعی کسی گناہ کا ارتکاب تھا۔ کیا وہ محض ایک قدرتی غلطی تھی۔ کیا وہ ساری عمر زبان، کانوں اور آنکھوں کی نعمتوں سے محروم رہے گا۔ کیا وہ بیکار سوسائٹی پہ بوجھ بن کر جیئے گا ——— وہ باپ تھا۔ وہ اس بچے کا نگہبان تھا۔ وہ اس کا محافظ تھا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے کے لئے کیا مستقبل سوچا تھا۔ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیشہ غصے اور جوش سے کانپنے لگتا۔

وہ اپنی بیوی سے اسی لئے نفرت کرتا تھا کہ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی بیوی ہر ماں کی طرح جذباتی تھی۔ اسے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ اسے اسی اندھے گونگے بہرے سے محبت تھی۔ وہ کتنی کتنی دیر تک اسے چومتی رہتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے اور وہ روتی اور بچے سے پوچھتی۔

"تم بڑے ہو کر ——————"

اسی لئے اسے اپنی بیوی سے از حد نفرت تھی۔ اس اختلاف کی وجہ وہ ناقابل بچہ تھا۔ وہ باپ ہو کر یہ چاہتا تھا کہ وہ بچہ مر جائے۔ یہی اس بچے پر احسان ہو سکتا تھا۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ اس کا گلا دبوچ لینا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی ایک باز کی طرح اس پر جھپٹ پڑتی اور اسے کمرے سے نکال دیتی۔ وہ دروازہ بند کر کے گھنٹوں رویا کرتی۔ وہ باہر بیٹھا ہر روز تہیہ کرتا، عزم کرتا ——— قسم کھاتا کہ وہ اس بچے کو مار ڈالے گا۔

اس نے کئی بار اپنی بیوی سے احتجاج کیا تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس کی بیوی نے سنی ان سنی کر دی۔ اور کہا تھا کہ اس کے برخلاف وہ پاگل ہو جائے گی۔ اور پھر کبھی کبھی کئی روز تک دونوں نہیں بولے تھے۔ اور وہ قسمیں کھایا کرتا اور وہ اسے چومتی اور رویا کرتی ——— لیکن وہ دونوں اس بچے کو چاہتے تھے۔ ان دونوں کے ملاپ اس کی بہتری کے لئے تھے۔ اگر وہ زندہ نہ رہتا تو بے شک خوش قسمت ہوتا اور اگر وہ مر جاتا تو یقیناً بدقسمت ہوتا۔ کیونکہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔

اسے واقعی پیاس لگی تھی۔ لیکن اس کی مجبوریوں اور تکلیفوں میں چیونٹی کی موت ایک نیا اضافہ تھی۔ اور وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے رنج کس بات کا تھا۔ جب وہ بچہ پیدا ہوا تو ان کے رشتہ داروں نے کتنی مبارکبادیاں دی تھیں۔ وہ کتنے خوش تھے۔ دلکش وہ کبھی نہ ہوا تھا لیکن وہ اسے چاہتے تھے پھر یکایک اسے کیا ہو گیا؟

اسے پھر اپنی بیوی پر طیش آنے لگا۔ اس نے پانی میں چیونٹی ڈال دی تھی اور پھر اسے موت کے حوالے کر دیا تھا۔ یکدم کی موت نہیں۔ گندگی میں پھنس کر تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے۔ کسی طرح بھی یہ تشبیہ اسے بہت محسوس ہوئی۔ بچہ سوتے سوتے چونکا لیکن وہ بے حس اسی پہلو پر لیٹا رہا۔ وہ واپس کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی داخل ہوئی۔ وہ بچے کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔

"میرے لعل۔ میرے لعل۔"

وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے لعل کہتی تھی۔ وہ اس کی دشمن تھی۔ وہ اسے ٹھوکریں کھاتا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ عورت نہ تھی، وہ ماں نہ تھی وہ خود غرض ظالم خونخوار حیوان تھی۔ اس نے محض اپنے دل میں یہ سب کچھ کہنے پر قناعت کی۔

"میرے پیارے بچے۔ میرے چاند۔ طبیعت کیسی ہے۔۔۔۔۔؟"

وہ باہر بھاگا۔ دروازہ پر وہ ڈاکٹر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سلام دعا کے بعد وہ باہر چلا آیا۔ ڈاکٹر بچے کا معائنہ کرنے آیا تھا۔ کیونکہ ماں اس کی خاموشی پر پریشان تھی۔ گویا عام طور پر وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے کا عادی ہو۔

وہ گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ بے مقصد سڑکوں پر گھومنے لگا۔ آخر اسے اپنی پیاس کی شدت بڑھتی محسوس ہوئی۔ وہ ایک ریستوران میں جاکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ مختلف زاویوں چوپڑے میزوں کے گرد لوگ ہنس کھیل رہے تھے۔ یہ دنیا بہت عرصہ ہوا اس نے دلچسپی سے دیکھی تھی جیسے کوئی رنج نہ تھا۔ بیچارگی نہ تھی۔ کوئی غم اور تکلیف نہ تھی۔ فاتحانہ مسکراہٹیں۔ وہ وہیں بیٹھا حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے لیمن منگایا۔ اس نے دو گلاس پیے اس کے ذہن کی ہلچل شاید پیاس پر مبنی تھی۔ کیونکہ آہستہ آہستہ وہ شگفتگی کا احساس کرنے لگا۔ اپنے گرد شور کا احساس اسے اب ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ کا احساس، بھیگی بھیگی ہوا کی خوشگواری کا

احساس، موٹروں اور تانگوں کا احساس، ریستوران میں آتے اور جاتے لوگوں کے ساتھ اپنے اپنے ماحول کا احساس ـــــــ اسے ایسا لگا کہ وہ دوزخ سے ابھر آیا ہے۔ اسے ایسا لگا کہ وہ ایک رات کے بھیانک تفکرات سے چونک کر اٹھا ہے۔ دنیا میں شگفتگی ہے، اگر اس کی کمیاں اور غلطیاں رد کر دی جائیں۔ اگر انہیں دور کر دیا جائے۔ اگر دنیا کو صحیح زاویے سے دیکھا جائے۔ جیسے وہ وہاں اس وقت معائنہ کر رہا تھا۔

اس نے باہر دیکھا۔ دروازے کی جنبش کے بعد ایک تندرست مرد، عورت اور دو چھوٹے چھوٹے بے حد شیریں۔ اور خوبصورت بچے داخل ہوئے۔ بچوں کو دیکھ کر اسے پھر سوئیاں چبھنے لگیں۔ اسے اپنا بھیانک بچہ نظر آنے لگا۔ اس نے نگاہیں آئیس کریم کپ پر گاڑ دیں۔

اس نے پھر باہر دیکھا۔ دو تین خوفناک قسم کے گندے چیتھڑوں میں ملبوس لولے لنگڑے، اندھے بھکمنگے روزی کمانے کے لئے کھڑے تھے۔ وہ بیچارے منگتے کسی بھی کام کے قابل نہ تھے۔ ان کے اعضا مکمل نہ تھے۔ وہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ تجربہ کار مزدور نہ تھے۔ وہ بیکار تھے۔ اس کے بیٹے کی طرح۔

اگر اس کا بیٹا زندہ رہا، اگر وہ بڑا ہو گیا تو وہ کیا کریگا۔ اس نے وہاں قسمیں کھائیں اپنے ضمیر سے وعدے کئے۔ مصمم طور پر عزم کیے کہ وہ اسے مار ڈالے گا۔ کیونکہ وہ اس کا باپ تھا اور اس کی بیچارگیوں کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا بچہ بدصورت تھا۔ جب وہ مسکراتا تھا تو بدتر ہو جاتا تھا۔ اور جب روتا تو بدترین شکل بن جاتی تھی۔ اسے خود ڈر لگنے لگتا تھا۔

وہ باہر جانے لگا تھا جب اس نے دیکھا اسے اس کا دوست بلا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں

کرتے رہے۔ "سنو، وہ تم سے بہت ناراض ہے۔"

"کیوں۔۔؟"

"وہ بیمار ہے۔" اس کے دوست نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔ بھلا اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

"میں ایک بار گیا تھا۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"محض ایک بار۔"

"اچھا اب جا رہا ہوں۔"

پھر وہ رکا نہیں۔ اسے ساری عمر شاید مریضوں کی تیمارداری ہی کرنی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس مریض کی مزاج پرسی کے لئے چل پڑا۔

وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ وہ کتنے عرصہ۔۔ اپنے آپ سے باہر ہو چکا تھا۔ کیا وہ اس وقت کسی اور پہلو پر سوچ نہیں سکتا تھا۔ وہ اسی ایک خیال میں مبتلا تھا۔ چنانچہ اسے اپنی بیوی سے شکایت تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کا بیٹا جو بے حس تھا، کسی بھی آواز یا گونج سے محروم کسی نظارے سے بے نیاز چنانچہ ہر لفظ اور احساس سے دور ــــــ اس نے زندگی کو نہ پہچانا تھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ یوں بھی مردہ تھا۔ اسے کیا معلوم کہ ماں یا باپ یا فرحت یا غم یا تکلیف یا دنیا کا دکھ کیا ہیں۔ اسے کیا معلوم کہ یہ کشش کیا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہوگا۔ کیا وہ سوچ بھی سکتا ہے۔ اسے احساس کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر وہ احساس کے بغیر زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ قدرت کا کیا معجزہ ہے۔ کیسی غلطی ہے۔۔۔۔۔۔ غلطی ہے اور وہ اس خامی کو دور کر دے گا۔ اس بچے کی خاطر جو بے حس ہے۔

وہ آخر مریض کے مکان تک پہنچ گیا۔ اس نے آخری لفظ دہرائے۔

اگر ایک مشہور نام نہ پایا جا سکے۔ تو زندگی سے بیزار نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا آدمی جسے کچھ علم ہی نہ ہو کہ وہ خود کیا ہے، کون ہے۔ اس کا زندہ رہنا ہی اس کے اپنے لئے دوزخ ہوگا۔ جذباتی پن کو چھوڑ کر اس پر احسان کرنا چاہیئے۔ اس بے حس روح پر ــــــــ

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، پھر اس نے ارد گرد دیکھا۔ سڑک پر چند کار موجود تھے۔

جلد ہی دروازہ کھلا۔ "مرلیفہ کی طبیعت ــ"

"ہش ــ" اس آدمی نے سرگوشی میں کہا ــ "بھابی آخری سانس لے رہی ہیں ــ"

"کیا ــ" اس نے قدرے بلند آواز سے کہا ــ اس آدمی نے اسے پھر گھورا ــ وہ یکدم چپ ہو گیا ــ

"میں نے کہا تھا کہ بھابھی ــــ"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں ــ" وہ بھی اب سرگوشی میں بولا ــ "میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں ــ"

اشارہ ملنے پر وہ ایک چور کی طرح حساس قدموں سے اندر چلا گیا ــ اس کا ساتھی بستر کے نزدیک جا پہنچا تھا ــ وہ دروازے پر ہی رک گیا ــ اس کا ضمیر سخت نہ تھا ــ وہ زیادہ نزدیک نہیں جا سکتا تھا ــ

"بھائی ــــ" مرلیفہ نے اس کے بارے میں سن کر کہا ــ

اب کوئی چارہ نہ تھا ــ وہ نزدیک پہنچ کر ہاتھ جوڑے کھڑا ہو گیا ــ

"بھائی ــ میں بہت تکلیف میں ہوں ــ" مرلیفہ رونے لگی ــ "میں بہت پریشان ہوں ــ میں بہت تھکی ہوئی ہوں ــ میں ــــ ــ

مرلیفہ کی آواز صاف نہ تھی ــ اس نے مرلیفہ کو بغور دیکھا ــ اس کا چہرہ ہمیشہ خوفناک ہوا کرتا تھا ــ لیکن اب وہ اور بھی دہشت پیدا کر رہی تھی ــ اس کا پستہ قد، چابکی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں، بازو، چھوٹا سا جھریوں دار چہرہ، گول گول آنکھیں، سیاہ

ہونٹ، سبز اور زرد رنگ، وہ اسے بہت بے جوڑ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھنے سے محروم ہیں۔ اسے یہ سن کر افسوس ہوا۔ اس کے ساتھی نے سرگوشی کی۔ "کل سے ان پر فالج کی کیفیت ہے۔ دائیاں پہلو بیکار ہو گیا ہے۔ کچھ کھا نہیں سکتیں ہضم نہیں ہوتا۔ کھائے بغیر آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ ساری رات تڑپتی رہی ہیں۔ نہ خود آرام کیا ہے۔ نہ کسی کو ــــــ" یہاں اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگا۔

اس تمام عرصے میں مریضہ بڑبڑاتی رہی۔ ایک عورت اس کے پاؤں مسل رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "ڈاکٹر کو بلا لیتے۔"

"ابھی ابھی گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "منہ ناک میں سے خون آ رہا ہے۔ وہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ اس کے بس میں تھا، اس نے کیا۔ ہزاروں روپے خرچ ہو گئے ہیں۔"

کیوں۔ وہ کہنے ہی والا تھا۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ وہ بدشکل بدزیب عورت جو عمر کے تقریباً ساٹھ برس گزار چکی ہے۔ جو دنیا میں کوئی حصہ نہیں لیتی۔ جو کسی کام کے قابل نہیں۔ ایسی بدصورت عورت کی خاطر ہزاروں روپے کیوں خرچ ہو گئے۔

"تمہیں بلا رہی ہیں۔" اس کے ساتھی نے اسے چھوا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے مریضہ کو اب پوری طرح دیکھا۔ اس کا پیٹ پھول گیا تھا۔ دراصل وہ سر سے پاؤں تک پیٹ کے ابھار میں کھو گئی تھی۔ اس کی پلکیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی بھیانک تھی۔

"ان کے پیٹ میں پانی نجانے کیسے بھر گیا ہے۔" اس آدمی نے حیرت سے کہا۔ "یہی تو ساری وبا ہے۔" مریضہ پھر چیخی۔ "مجھے بتاؤ۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا اب میں تندرست ہو سکوں گی۔ کیا مجھے ڈاکٹر بچا لے گا۔ کیا میں ــــــ"

وہ سنتا رہا۔ اس بوڑھی عورت کی پریشانی غمناک تھا۔ وہ وعدے کر رہی تھی کہ وہ اب ایک بار تندرست ہو جائے تو نیا بنگلہ خریدے گی۔ کم سے کم چار نوکر رکھے گی۔ خود رسوئی میں کبھی کام نہیں کرے گی۔ برتن نہیں مانجھے گی۔ کپڑے خود نہیں دھوئے گی۔ باورچی خانے میں سے آمدنی کا ذریعہ نہیں بنائے گی۔ غریبوں میں روپیہ بانٹے گی۔ نئے زیور بنائے نئے کپڑے پہنے گی۔ لذیذ کھانے مہیا کرنے میں کبھی دریغ، کنجوسی کوتاہی نہ کرے گی۔ زندگی کو بہترین طریقے سے گذارے گی۔ اپنی ساری دولت کھو دے گی۔ زندگی ——
زندگی —— چند اور سانس۔ ایک دور۔ نہ اور —— ایک دو گھنٹے ہی سہی۔ اس تکلیف میں ہی سہی۔ اور پھر وہی سوال تھا۔ "کیا ڈاکٹر مجھے بچائے گا۔ کیا میں بچ جاؤں گی۔ تندرست ہو جاؤں گی۔" اور پھر وعدے۔

وہ سنتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ مریضہ کی بے چینی بڑھ گئی۔ تیماردار عورت نے کافی روکنے کی کوشش کی۔ آخر اس کا ساتھی اسے باہر لے آیا۔ مریضہ کو کچھ علم نہ تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "مجھے بچاؤ۔" پھر خوف اور ڈر کے احساس سے وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی سسکیاں تھم گئیں۔ وہ دونوں چیخ سن کر دروازے میں ہی رک گئے تھے۔ مریضہ نے روتے روتے آہستہ آہستہ نیچی آواز میں کہا۔ "مجھے بچاؤ —— ڈاکٹر —— ایک سو روپیہ —— ایک روز ——" پھر وہ بیہوش ہو گئی۔

وہ دونوں باہر آ گئے۔ وہ خاموش رہا۔ اس کے ساتھی نے بتایا کہ وہ اکثر بیہوش رہتی تھی۔ وہ واپس چلا آیا۔

راستے میں اس کا بے چین دل اور بھر آگیا۔ وہ دہشت ناک عورت زندگی مانگ رہی تھی۔ "ڈاکٹر —— ایک سو روپیہ۔ ایک روز ——" تاہم اس نے زندگی کے لوازم اور شیرینی کا احساس کیا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا۔ وہ کس لئے زندگی چاہے۔ راستے میں وہ ڈاکٹر کی دوکان پر رک گیا۔ ڈاکٹر نے اسے

مشورہ لیتا تھا۔ اس نے اس کے بیٹے میں کیا نئی بات پائی تھی۔ وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر نے اچانک اسے دیکھا اور اٹھ کر اپنی ایک کاپی نکالی۔ تھوڑی دیر وہ بڑی سنجیدگی سے ورق الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر اس نے بغور دیکھ کر کہا۔

"آپ کے بچے کا میں نے آج معائنہ کیا تھا۔ تاریخ .... نام .... ولدیت .... عمر .... بچے کے کانوں میں نقص بڑھ گیا ہے۔ اب وہ قطعی دھماکہ سننے کے قابل نہیں۔ اس کی آنکھیں بدستور بے نور ہیں اور رہیں گی۔ اس کی زبان بند ہے۔ کچھ تو انہیں باتوں کا اثر ہے کہ اسے اردگرد کی کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ اور وہ کسی گونج یا لفظ کو نہیں پہچانتا۔ لیکن اس کی زبان ویسے بھی تندرست نہیں۔ وہ کبھی بولنے کے قابل نہ ہوگا۔ آج اس میں ایک نیا ــــــ"

"کیا ــــ؟" وہ چیخا۔

ڈاکٹر نے کتاب بند کر دی۔ اس نے پھر اسے بغور دیکھا۔ "یہ بات میں نے والدہ کو نہیں بتائی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی بے حد خوف زدہ ہیں۔ لیکن تمہیں یہ بات سننی چاہیئے۔ اس کے پاؤں بیکار ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک روز ناکارہ ہو جائیں۔" ڈاکٹر نے یہ الفاظ بڑی نرمی سے کہے۔ پھر اس نے کہا۔

"اس کا دل تندرست ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کا دل تندرست ہے۔ اس کی زندگی کے بارے میں شکوک کی فی الحال کوئی گنجائش نہیں۔"

"نہیں ــــ؟" اس نے بلند آواز میں دہرایا۔

"نہیں۔۔" ڈاکٹر نے بیحد نرمی سے اسے حوصلہ دینے کے لئے کہا۔

وہ رو پڑا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ڈاکٹر خاموش اسے دیکھتا رہا۔ "واقعی یہ بالکل نیا واقعہ ہے۔ میں نے ساری عمر ــــــ عمر بھر ایسا واقعہ نہ دیکھا تھا۔ ایسے حادثے سنے تو تھے لیکن دیکھا نہ تھا۔ اس کی زندگی پر کوئی خطرہ نہیں۔ وہ جئے گا۔"

"وہ زندہ رہے گا۔؟"

"بے شک۔"

"ایسے بیکار، ناقابل آدمی کی زندگی کس قابل ہوگی۔ وہ کتنا بدنصیب ہوگا۔ وہ کتنا بدنصیب ہے۔ اس کی آنکھیں، زبان، کان اور اب پاؤں بیکار ہیں۔ اسے کس بات کا احساس ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے آنسو دل میں تر کہا۔

"اور جیسے جیسے اس کی عمر بڑھے گی، اس کے ہاتھ بھی بیکار ہو جائیں گے۔ پھر ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات بھی ضروری ہے۔ کہ اس کا دماغ جو پہلے ہی بہت کم احساس رکھتا ہے۔"

"احساس رکھتا ہے۔؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"بہت کم احساس رکھتا ہے۔ بالکل بے حس ہو جائے گا۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس کے تمام اعضاء بیکار ہو جائیں گے۔ لیکن آہستہ آہستہ یکدم نہیں۔ پھر وہ شاید ——" ڈاکٹر نے رک کر اسے پھر دیکھا۔ "اس کی زندگی دل پر منحصر ہے۔ جب دل بے حس ہو گیا تو —— لیکن یہ تمام باتیں پندرہ برس کے لگ بھگ عرصہ میں ہوں گی۔ میں اعلانیہ شرط کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس سے زیادہ یا کم نہیں جی سکتا۔ یہ ایسا ہی ہوگا۔" ڈاکٹر نے پورے استقلال سے کہا۔ "اس سے پہلے ——"

اس عرصہ میں اس کے آنسو سوکھ گئے تھے۔ وہ جوش میں بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔ پندرہ برس تک اس کا بیٹا دنیا میں اپاہج ہو کر گھسٹے گا۔ وہ اسی طرح زندگی بھر تکلیفیں جھیلے گا —— نہیں، اس نے فیصلہ کیا۔ وہ اب ایک گھنٹہ بھی نہ جئے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ڈاکٹر کو کہا۔ "وہ بیکار ہے۔ وہ بالکل گویا بیکار ہے ——" اور وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"بچہ متحیر کن ہے۔ بچہ بالکل نئی روشنی ہمیں دے رہا ہے۔ ہمیں

ڈاکٹروں کو ۔ میں اس حادثے پر، قدرتی حادثے پر کتاب لکھوں گا ۔ میں کئی نئے پہلوؤں
پر روشنی ڈال سکوں گا ۔ اس کا وجود ہمارے لئے ایک تحفہ ہے ۔ وہ ایک کارآمد ۔"

وہ یکدم وہاں سے چلا گیا ۔

وہ اپنے بیٹے کو ایک نئی مثال بنانے پر راضی نہ تھا ۔ طب کو بڑھانے
کے نئے اور نئی معلومات کے لئے اس کے بیٹے کی بدقسمتی اور کمزوری ہی ضروری نہ تھی ۔
وہ ان سب کی خاطر اسے زندہ نہیں رکھے گا ۔ اور اس طرح وہ نہیں گھٹے گا ۔ وہ ایک
اپاہج کی زندگی نہ گزارے گا ۔ اگر دنیا کو اس کی کوئی ضرورت بھی ہو تو یہ اس کے لئے عذاب
ہے ۔ وہ بیچارہ بے گناہ ہے ۔ اسے کیا معلوم ۔ وہ بے حس ہے ۔ ڈاکٹر نے صحیح کہا تھا ۔
وہ بول نہیں سکتا کیونکہ اسے گونج یا آواز کا علم بھی نہیں ۔ اسے زندگی کا احساس ہی نہیں ۔

وہ گھر پہنچا ۔ ایک ایسے کام کو سرانجام دینے کے لئے جو بڑا مشکل تھا ۔ جسے
پورا کرنے کے لئے مکمل وحشت کی ضرورت تھی ۔ اور وہ وحشی ہو گیا ۔ وہ سیدھا بچے
کے کمرے کی جانب بڑھا ۔ اس کی بیوی نے اسے بلایا ۔ اس نے اسے کچھ کہا ۔ لیکن وہ اپنے
آپ میں نہ تھا ۔ وہ سننے سمجھنے کے قابل نہ تھا ۔ وہ اندر بڑھ ہو گیا ۔ مگر وہ بچہ اس وقت
مسکرا رہا تھا ۔ وہ خوش تھا ۔ وہ کس بات پر خوش ہو سکتا تھا ۔ اسے کس احساس پر مسرت
ہو سکتی تھی ۔ وہ کیوں مسکرا رہا تھا ۔ اس نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھا ۔ بچہ چونک پڑا ۔
اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اس کی انگلیوں کو ٹٹولا ۔ اس نے انہیں اپنے گلے کی طرف
بڑھتا محسوس کیا ۔ اس نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی ۔ وہ ساتھ ہی ساتھ مسکراتا
رہا ۔ اپنے چہرے کے بدتر نقوش کے ساتھ ۔ اس کا ہاتھ بچے کے گلے کو دبانے لگا ۔ بچے
نے ہاتھ پرے کر دینا چاہا ۔ اس نے انگلیوں کو پکڑ کر دور کرنے کی کوشش کی لیکن
اس کا ہاتھ گلے کو مضبوطی سے پکڑ چکا تھا ۔ بچے کی مسکراہٹ ختم ہو گئی ۔ اس کا چہرہ
بدترین ہو گیا تھا ۔ !!! وہ رو رہا تھا ۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا ۔ ہاتھ کا دباؤ زیادہ
ہو گیا ۔ بچے کے چہرے پر حیرت اور خوف کا احساس پیدا ہو گیا تھا ۔ ہاتھ بے حد

مضبوطی سے اس کے گلے کو دبا رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی تھی۔
یکدم وہ پھر چونکا۔ ایک مظلوم مقتول کی طرح اس نے اپنی بے نور آنکھوں کو پھیلا کر اسے دیکھا۔ اس نے پوری طاقت سے اس کے ہاتھوں کو دور کرنا چاہا۔ پورے خوف اور ڈر سے اس نے چیخنا اور رونا چاہا۔ اس نے زندگی کے لئے آخری جد وجہد کی۔ پھر یکدم اس کے ہاتھوں نے اس بڑے اور خوفناک ہاتھ کو دھکیلا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ زندگی کے لئے اس کی پر زور کوشش اور تڑپ حد سے گزر گئی۔ ان بڑے بڑے ہاتھوں نے اس کا گلا آزاد کر دیا۔
کافی دیر وہ تھکا ماندا ہانپتا رہا۔ نہیں، وہ اس بچے کو مار نہیں سکتا تھا۔ اس میں موت کا مقابلہ کرنے کی قوت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ زندگی کا پر لطف احساس اسے بھی تھا۔!!!
وہ کرسی پر بیٹھا پسینے میں شرابور تھا۔ وہ بچہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی پر زور کوشش تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کافی دیر کے بعد اس کی بیوی کے الفاظ اس کی سمجھ میں آئے۔ وہ مریضہ مر گئی تھی۔ اس کے آخری الفاظ تھے۔
"ڈاکٹر ـــــ ایک سو روپیہ ـــــ ایک روز ـــــ
وہ کافی دیر تک مطالعہ کرتا رہا۔

ختم شد